شیخ الہند مولانا

محمود حسن

غفران احمد ایم۔اے

دیوبند کی مسجد چھتہ میں
انار کا درخت جس کے سایہ
میں دارالعلوم کا آغاز
ہوا تھا۔

نوجوان نسل کو تحریکِ آزادی کے قائدین سے متعارف
کرانے کے لیے قومی اِتحاد ویک جہتی کے پس منظر میں
سلسلۂ تصانیف کی تیسری کتاب :

شیخ الہند

مولانا محمود حسن

جس میں ہندوستان کو برطانیہ کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے
شیخ الهند کی انقلابی تحریک مالٹا میں ان کی نظربندی،
علماء ہند کے مجاہدانہ کارناموں، قید وبند اور ایثار وقربانی
کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

غفران احمد ایم۔اے

قیمت مجلد ———— ۱۴ روپے
قیمت غیر مجلد ———— ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ

فیضان بُک سپلائرز، ۱۴۶۴ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

نام کتاب ______ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
مصنف ______ غفران احمد ایم، اے
تعداد اشاعت ______ ایک ہزار
ماہ و سنِ اشاعت ______ نومبر ۱۹۸۶ء
نام مالک طابع و ناشر ______ فیضان بک سپلائرز
۱۴۶۴ قاسم جان اسٹریٹ، دلّی ۱۱۰۰۰۶
طباعت ٹائیٹل ______ پرنٹ کرافٹ آرٹ پریس دہلی۔
پرنٹنگ پریس ______ نیو پبلک پریس دہلی
ٹائیٹل ______ مولانا محمد یوسف قاسمی و نواب آرٹسٹ
کتابت ______ مولانا نعیم احمد
آزاد اسٹڈی سرکل کے زیر اہتمام شائع کی گئی۔

سرورق ______ دار العلوم دیوبند کی تصویر

خط و کتابت کا پتہ:۔

فیضان بک سپلائرز

۱۴۶۴ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

FAIZAN BOOK SUPPLIERS
1464. Qasimjan Street, Delhi-110006

انتساب

میں اپنی اس کاوش کو نائب امیر الھند

حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی مدظلہٗ

صدر جمعیۃ العلماءِ ھند کے نام نامی سے منسوب

کرتا ھوں جن کی زندگی ھمہ وقت خدمتِ خلق

اور انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف ھے ..

ناچیز

غفران احمد ایم۔اے

فہرست:

اظہارِ تشکّر

کتاب کی تیاری میں جن حضرات نے کسی بھی طرح میرا حوصلہ بڑھایا ہے اور تعاون کیا ہے۔ میں ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان میں سے چند حضرات کے نام دیئے جاتے ہیں۔

مولانا مرغوب الرحمٰن مہتمم دار العلوم دیوبند

جناب سنتوش کمار نیوز ایڈیٹر پرتاپ

جناب رشید احمد شروانی

جناب محمد عتیق صدیقی صدر آزاد اسٹڈی سرکل

جناب انیس جامعی جنرل سکریٹری

اس موقعہ پر مرحوم جناب ولی محمد خاں بابرؔ کا تذکرہ ضروری ہے۔ مجاہدینِ آزادی پر عام فہم کتابوں کی تحریک انھوں نے ہی کی تھی اور اس سلسلہ کا سہرا ان ہی کے سر بندھتا ہے۔

غفران احمد ایم۔ اے

پیغام: حضرت مولانا قاضی سجاد حسین پرنسپل مدرسہ عالیہ فتحپوری دلّی

Qazi Sajjad Husain

TELEPHONE: 261214
2115 AHATA KALEY SAHIB
QASIM JAN STREET
DELHI-110006

بسمہ

عزیز محترم مولوی غفران احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مجھے یہ معلوم کر کے انتہائی خوشی ہوئی ہے کہ تذکرہ مجاہدین آزادی ورہنمایان حریت کے سلسلہ کی ایک قسط کتاب "شیخ الہند مولانا محمود حسن" عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ خدا کا فضل ہے کہ ہماری نسل میں ایسے نوجوان پیدا ہو رہے ہیں جو آزادی کی راہ میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کو تحقیق کے ساتھ زندہ رکھنا اپنا قومی فرض سمجھتے ہیں۔ آپ نے یہ سلسلہ شروع کر کے ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اور ایک نوجوان طبقہ کی پیاس کو بجھانے کا بندوبست کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا یہ مشن کا سلسلہ بہت پھلتا پھولتا رہے گا اور ملک میں ہمارے ان اکابر کی خدمات اور قربانیوں کا قرار واقعی اعتراف کیا جائے گا۔

میں دست بدعا ہوں کہ خدا آپ کو اس عظیم مقصد میں فائز المرام اور کامیاب فرمائے۔

سجاد حسین

30/11/86

پیغام: محترمہ مسز تاجدار بابر ڈپٹی چیرمین میٹروپولیٹن کونسل دلّی

DEPUTY CHAIRMAN
METROPOLITAN COUNCIL
DELHI

TAJDAR BABAR,
CHAIRPERSON
DELHI STATE HAJ COMMITTEE,
DELHI ADMN.

27-11-1986.

Dear Ghufran Ahmad,

I am very glad to hear that you are writing a book on Shaikhul Hind Maulana Mahmud Hasan. He was a great revolutionary of India. He led the revolutionary movement against the British during the first two decades of the century.

Shaikhul Hind and his four companions were arrested and imprisioned in Malta for 3 1/2 years (Jan. 1917-June 1920) for launching "Silken Letters Conspiracy".

The present generation should take the inspiration from the life of this great revolutionary.

My heatiest congratulations to you for this work of national importance.

Tajdar Babar
(TAJDAR BABAR)

پیغام: منجانب مولانا صدرالدین انصاری ناظم جمعیۃ علماء ہند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Jamiat-Ulama-i-Hind
1-BAHADUR SHAH ZAFAR MARG, NEW DELHI - 110 002.

جمعیۃ علماء الہند
ید اللہ علی الجماعۃ

عزیز القدر میاں عفران صاحب بعافیت باشند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مجھے یہ معلوم ہو کر بیحد مسرت ہوئی کہ آپ سرخیل مجاہدین شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب نور اللہ مرقدہ کی شخصیت کارنامے اور انقلابی تحریک پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں

حضرت شیخ الہند تحریک استقلال کے مایہ ناز مجاہد عظیم تھے جب موصوف نے اس وقت آزادی کامل کے لئے انقلابی تحریک چلائی جب ہندوستان میں دور دور تک آزادی کا تصور نہ تھا اس پاداش میں برطانوی حکام نے انھیں اور ان کے رفقا کو ساڑھے تین برس تک مالٹا میں نظر بند رکھا۔ ان ہی قربانیوں کی بدولت یہ ملک آزاد ہوا

آج بھی جمعیۃ علمائے ہند کی جدوجہد حصول مقاصد انکی یاد تازہ کر رہی ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ماضی کی تاریخ مستقبل کیلئے رہنمائی کرتی ہے۔ آپ نے تحریک حریت کے رہنمایان سے واقفیت کرانے کیلئے جو سلسلہ تصنیف شروع کیا ہے وہ ایک مبارک قدم ہے۔

میری دعا ہے کہ آپ کی یہ کوشش مقبول خاص و عام ہو اور آپ اپنے مشن میں کامیاب ہوں۔ والسلام

دعاگو

صدرالدین انصاری
ناظم جمعیۃ علمائے ہند

[illegible]

اپنی بات

تحریک آزادی کے رہنماؤں سے نوجوان نسل کو متعارف کرانے کے لئے فروری ۱۹۸۵ء میں کتابوں کا جو سلسلہ شروع کیا گیا تھا زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی تیسری کڑی ہے۔ فروری ۱۹۸۵ء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ پر اور دسمبر ۱۹۸۵ء میں مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاںؒ پر کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اب نومبر ۱۹۸۶ء میں ملک کی تحریک آزادی کے سرخیل اور سب سے بلند قامت رہنما حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ پر کتاب آپ تک پہنچ رہی ہے۔

شناسا حلقوں میں سے کئی افراد نے اور ناظرین کرام کی خاصی تعداد نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے کہ جن شخصیتوں پر آپ قلم اٹھا رہے ہیں ان سب پر کتابیں موجود ہیں۔ اور آپ سے زیادہ قابل لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان سب کو میرا جواب یہ ہے کہ یہ کتابیں ایک خاص مشن کے تحت لکھی جا رہی ہیں۔ ضخیم تحقیقاتی کتابیں لائبریریوں یا انفرادی کتب خانوں کی زینت بن جاتی ہیں جب کہ میرا مشن یہ ہے کہ اپنی کتابیں زیادہ سے زیادہ لوگوں خصوصاً نوجوان نسل تک پہنچاؤں۔ ان کتابوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اس ملک کی تحریک آزادی میں مسلمانوں نے جو حصہ لیا ہے وہ ہماری نوجوان نسل کے سامنے کھل کر آئے گا۔ ان کے اندر یہ خود اعتمادی پیدا ہوگی کہ اس ملک کی تمام سرگرمیوں۔ اچھے اور برے وقت

اور ہر نشیب و فراز میں ہم ساتھ رہے ہیں۔ جو لوگ ہمیں قومی دھارے میں شمولیت کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ غلطی پر ہیں۔ اور غلط مقام پر کھڑے ہیں۔ قومی دھارا تو ہم خود ہیں۔ قومی دھارے کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں ؟ اگر ان میں سے مسلمانوں کو نکال دیا جائے تو رہ ہی کیا جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی سیاست کا ایک دور ختم ہو گیا۔ اور دوسرا دور شروع ہوا۔ آزاد ہندوستان میں جنم لینے والے مسلمان ماضی کی غلطیوں کی ذمہ داری اپنے سر لینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ملکی تقسیم کے پیچھے کیا محرکات تھے۔ ابھی تک ان کا تجزیہ جاری ہے۔ اس تقسیم کے لئے کسی ایک فرد یا فرقہ کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ آزاد ہندوستان میں جنم لینے والے جب اپنے ماضی کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو فخر سے ان کا سر اونچا ہو جاتا ہے چونکہ اس ماضی میں انھیں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حافظ ضامن شہیدؒ، حضرت حاجی امداد اللہؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا ابو الکلام آزادؒ، حکیم محمد اجمل خاں اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے تابناک چہرے نظر آتے ہیں۔

مجھے اس پر بڑی خوشی ہے کہ آج کا ہندوستانی مسلمان اپنی تمام تر مجبوریوں اور رکاوٹوں کے باوجود اپنا تاریخی کردار پوری طرح انجام دے رہا ہے۔ وقت آ رہا ہے۔ اس کا یہ تاریخی تعمیری کردار ملک کی ایک ضرورت بن جائے گا۔ آج کا مسلمان ہندوستانی تہذیب کا مکمل نمائندہ ہے۔ اس کا انداز فکر معقول اور خالص ہندوستانی ہے۔ اس بات کو میں بطور صفائی نہیں بلکہ بطور فخر پیش کر رہا ہوں۔ مسلمان کے اس کردار میں میں ماضی کا عنصر اور شامل کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے ہندوستانی مسلمانوں کی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔

مسلم نوجوانوں سے میری ایک اپیل ہے کہ جو لوگ ہندوستانی کرن

(Indianisation) کی بات کرتے ہیں۔ انھیں یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔
چونکہ یہ لوگ حال اور ماضی قریب سے اپنا رشتہ توڑ کر ایک ایسے ماضی بعید سے
رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں جو تاریخ کے اوراق میں گم ہے۔ ایسے ہی نکتہ چینوں میں سے ایک
سے میں نے پوچھ لیا تھا کہ یہ لفظ ہندوستانی کرن (Indianisation) کس
کی دین ہے۔ وہ بتا نہیں سکے تو میں نے کہا یہ لفظ عربوں کی دین ہے۔ یورپ عربوں کی
بدولت ہندوستان سے آگاہ ہوا۔ عرب اس ملک کو ہند کہتے تھے۔ انگریزوں نے اسے
انڈیا کا نام دیدیا۔ عرب کسی لفظ کو ہندوستانی بنانے کے عمل کو تہنید کہتے ہیں۔ یہی
Indianisation ہے۔ اس طرح کی تنگ نظری پر دل گرفتہ ہونے کی
ضرورت نہیں۔ علاوہ ازیں یہ طبقہ مذہب کو بھی ملکوں اور خطوں سے جوڑتا ہے۔ حالانکہ مذہب
اگر کچھ ایسے اصولوں کا نام ہے جو انسان کی سیرت اور کردار کی تعمیر پر اثر انداز ہوتے
ہیں تو اسے کسی علاقہ سے جوڑنا ایک بے معنی حرکت ہے مذہبی سچائیاں عالم گیر ہوتی ہیں۔

اب جب کہ ہم بیسویں صدی کے اختتام پر ہیں اور اکیسویں صدی میں قدم رکھنے والے
ہیں۔ ہمیں ایسی باتوں پر کان دھرنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا عالمیت -(Univarsal
ism) کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مقامیت پسندی کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی۔ بیسویں
صدی کے شہری کا طرہ امتیاز بین الاقوامیت بھی ہے۔ اس سے اس کے کردار کی تشکیل ہوتی ہے

ہماری ساری توقعات ملک کے سیکولر، روشن خیال، محب وطن اور روادار طبقہ سے
وابستہ ہیں۔ ان ہی کے تعاون سے ہم ہندوستان میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کر کے
اپنی انفرادیت منوا سکتے ہیں۔ اسی کا دوسرا نام شناخت ہے۔ اس مقام کو راستہ فرض
پسندی۔ عزم وحوصلہ اور تعلیم کی منزلوں سے ہو کر جاتا ہے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے
مرکزی حکومت سے ہماری توقعات وابستہ ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ وقت کے تقاضوں کو محسوس
کرتی ہے بلکہ ایک ترقی پذیر اور روشن خیال اسٹیٹ کی ساری خوبیاں اس میں موجود ہیں۔

ہمیں اپنی بات مرکزی حکومت کے ذمہ داروں تک زیادہ سے زیادہ پہونچانی چاہیئے۔

ہاں ایک بات مرکزی حکومت کی بھی ناگوار گذرتی ہے۔ ان کے ہاں پرانے برطانوی نظام کی فرسودہ روایت "رپورٹ سسٹم" ابھی تک موجود ہے۔ حکومت کا کام زیادہ تر متعلقہ ماتحت حکام کی رپورٹ کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ رپورٹ ہی کی بنیاد پر اہم فیصلے کئے جاتے ہیں۔ اگر اس نظام کو درمیان سے نکال دیا جائے اور اعلیٰ حکام یا وزراء برموقعہ معائنہ کی بنیاد پر فیصلے کریں تو بہت کچھ تبدیلی آسکتی ہے۔

آزاد اسٹڈی سرکل کے زیر اہتمام یہ کتابیں ایک مشن کے تحت لکھی جارہی ہیں مشن ہمیشہ صبر آزما ہوتا ہے۔

ناظرین کے تعاون سے میری پہلی کتاب مولانا ابوالکلام آزادؒ کافی نکل چکی ہے۔ اس کی کچھ جلدیں ابھی باقی ہیں۔ لیکن دوسری کتاب حکیم محمد اجمل خاںؒ ابھی کافی تعداد میں موجود ہے۔ ایک ہزار میں سے صرف تین سو کتابیں فروخت ہوئی ہیں۔ اگر یہ صورت حال رہی تو مشن چلانا مشکل ہو جائے گا۔ چونکہ اصل منصوبہ یہی تھا کہ کتاب پر جو سرمایہ لگایا جارہا ہے وہ واپس آتا رہے گا، اور اس کی بنیاد پر دوسری کتابیں شائع ہوتی رہیں گی۔ لیکن تیسری کتاب تک پہنچتے پہنچتے زر اصل نصف رہ گیا ہے۔

ناظرین کرام سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اس معاملہ میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ میری خواہش تو یہی تھی کہ ہندی، انگریزی اور دیگر علاقائی زبانوں میں بھی ان کتابوں کا ترجمہ ہونا چاہیئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس اہم کام کے لئے درکار وسائل میرے پاس نہیں۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ جلد یا بدیر میرے اس کام کی اہمیت کو تسلیم کر لیا جائے گا۔

آزاد اسٹڈی سرکل نے یہ برس حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے لئے وقف کیا تھا۔ ۳۰ نومبر کو ان کے یوم وفات پر اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ایک علمی مذاکرہ کا انعقاد اور ریڈیو اور ٹی وی پر پروگرام بھی عمل میں لائے جارہے ہیں۔ اگلا برس یعنی ۱۹۸۷ء

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی یاد منانے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ تصانیف کی چوتھی کتاب ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آئے گی۔ ناظرین کرام سے ایک بار پھر پرخلوص تعاون کی درخواست کی جاتی ہے۔

ابھی یہ سطور میں لکھ ہی رہا تھا کہ بھیماورم (آندھرا) سے محترم پروفیسر جناب نذیر احمد صاحب کا خط موصول ہوا اس میں یہ خوش خبری سنائی گئی ہے کہ میری کتاب "مولانا ابو الکلام آزاد" آندھرا یونیورسٹی والٹیر سے ملحق تمام ڈگری کالجوں کے سال دوم کے اردو نصاب میں داخل کر لی گئی ہے۔

تعلیمی سال ۸۷-۱۹۸۶ء سے اس کا شمار ہو گا۔ اس سلسلہ میں میں پروفیسر نذیر احمد کی مساعی کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ یہ مجھ پر ان کا ذاتی احسان تو ہے ہی۔ لیکن قوم پر بھی بڑا احسان ہے۔ میرے مشن کا بنیادی خیال یہی ہے کہ جنگ آزادی میں تمام فرقوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت حصہ لیا۔ مسلمانوں نے کچھ زیادہ ہی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ کیوں نہ مسلمان اپنے اسلاف کی ان قربانیوں کو یاد کریں۔ اور دنیا سے منوائیں۔ ہم اپنے حال کو ماضی سے الگ نہیں کر سکتے۔ ماضی میں ہمارے سیاسی کردار کی اہمیت تھی تو حال اور مستقبل میں کیوں نہیں ہو گی۔ ہندوستان میں مسلمان اپنے ماضی کی بنیاد پر کھڑے ہیں۔ تحریک آزادی ہی نہیں زندگی کے ہر شعبہ میں انھوں نے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہ ان کی موجودہ زندگی کا جلی عنوان ہیں۔

ہندوستان کے تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں اور امدادی مدارس و اسکولوں کے لئے یہ ایک قابل تقلید مثال ہے۔ اگر اس سلسلہ کی کتابیں نصاب کے مختلف سالوں میں شامل کر لی جائیں تو مجھے اپنے مشن کی تکمیل میں بڑی مدد ملے گی۔ ایک وقت آئے گا۔ ان کتابوں کے تراجم ملک کی دوسری علاقائی زبانوں میں کئے جائیں گے تاکہ تمام اہل ملک تک ہماری آواز پہونچے اس طرح ہم اپنے ہی ملک میں اپنا وجود

پوری طرح منوا سکیں گے۔ وقت آئے گا۔ ہمارے اس مثبت اور تعمیری کردار کو دنیا تسلیم کرے گی۔ انشاء اللہ اس نیک مقصد میں بیش از بیش تعاون ملے گا۔

اس کتاب کی تیاری میں ذیل کی کتابوں سے خاص طور پر مدد لی گئی۔

• عزیز الفتاویٰ :۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ • سوانح قاسمی :۔ مناظر احسن گیلانیؒ • نقش حیات :۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
• سفرنامہ شیخ الہندؒ :۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ • اسیران مالٹا :۔ مولانا سید محمد میاںؒ • علماء حق حصہ اول :۔ مولانا سید محمد میاںؒ
• تحریک شیخ الہندؒ :۔ مولانا سید محمد میاں • علماء ہند کا شاندار ماضی :۔ مولانا سید محمد میاں • تاریخ دارالعلوم حصہ اوّل و دوم :۔ سید محبوب رضوی
• جمعیۃ علماء ہند :۔ پروین روزینہ اسلام آباد پاکستان • سیرت سید احمد شہیدؒ :۔ مولانا غلام رسول مہر • حیات شیخ الہندؒ :۔ مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ
• دارالعلوم کی تاریخ سیاست :۔ مولانا شاہین جمالی • مقام محمود :۔ مرتب مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی • آزادی کی لڑائی میں علماء کا امتیازی رول :۔ مولانا اسرار الحق قاسمی • مشاہیر علماء دیوبند :۔ مولانا مفتی محمد نصیر الدین
• تاریخ جمعیۃ علماء ہند :۔ مولانا اسیر ادروی • تذکرہ اعرابی پاشا
• انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا

غفران احمد ایم، اے
چیف سب ایڈیٹر روزنامہ "پرتاپ"
نئی دلی

۲۰ نومبر ۱۹۸۶ء

ولادت، بچپن اور تعلیم

تحریک حریت کے عظیم رہنما حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی) کے عثمانی خاندان میں جنم لیا۔ ان کے والد مولانا ذوالفقار علی اپنے دور کے سر کردہ اور متبحر علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ بریلی کالج میں پروفیسر تھے۔ چند برس کے بعد محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر ہو گئے۔ بریلی ہی میں مولانا محمود حسنؒ کی ولادت ۱۸۵۱ء مطابق ۱۲۶۸ھ میں ہوئی۔

مولانا ذوالفقار علی نے دلّی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اور دلّی کالج کے فارغ طلبا کے اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جس نے علوم وفنون میں خاص امتیاز اور شہرت حاصل کی۔ دلّی میں اجمیری گیٹ پر دلّی کالج پہلا کالج تھا جس میں مشرقی زبانوں اور اسلامیات کے ساتھ انگریزی کی کلاسیں کھولی گئیں۔ اور علوم جدید کو نصاب میں شامل کیا گیا۔ پہلے اسے "مدرسہ غازی الدین" کہا جاتا تھا۔ چونکہ اسے غازی الدین فیروز جنگ نے ۱۷۱۰ء میں اپنی وفات سے کچھ قبل کھولا تھا۔ ۱۸۲۵ء میں اسے دلّی کالج میں تبدیل کر دیا گیا (اب اس کا نام ذاکر حسین کالج ہے)

مولانا ذوالفقار علی کا سلسلۂ تلمّذ دو واسطوں سے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے ملتا ہے۔ ان کے استاذ مولانا مملوک علی نے درسیات حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد رشید مولانا رشید الدین سے مکمل کیا تھا۔ مولانا مملوک علی اپنے دور کے

بحر العلوم تھے۔ ان کے شاگردوں میں مولانا ذوالفقار علیؒ کے علاوہ مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی، مولانا رشید احمدؒ گنگوہی، مولانا محمود یعقوبؒ نانوتوی، مولانا شیخ محمدؒ تھانوی مولانا جمال الدینؒ (مدار المہام بھوپال) مولانا محمد فضل الرحمنؒ دیوبندی، مولانا محمد منیر نانوتوی، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدینؒ بی۔ ایل۔ ڈی، مولوی کریم الدینؒ پانی پتی (مولف تذکرہ طبقات الشعراء) جیسے نام نظر آتے ہیں جو آسمان علم کے درخشاں آفتاب تھے۔

مولانا ذوالفقار علی کو عربی ادبیات پر عبور حاصل تھا۔ انھوں نے دیوان حماسہ دیوان متنبّی اور سبعہ معلّقہ کی شرح لکھی۔ اسی طرح عربی کے ایک مشہور قصیدہ بانت سُعاد کی شرح اور قصیدہ بردہ کی شرح بھی اردو میں لکھی ان میں ایک طرف عربی کی مشکل لغات اور محاوروں کا آسان زبان میں ترجمہ کیا ہے تو دوسری طرف تشریح عام فہم زبان میں کی ہے۔ ان کی ایک کتاب تذکرۃ البلاغت اور ریاضی میں تسہیل الحساب ہے۔ مولانا ذوالفقار علیؒ کے متعلق فرانس کا مشہور مصنف گارساں دتاسی لکھتا ہے۔

"وہ دلی کالج کے طالب علم تھے۔ چند سال کے لئے بریلی کالج میں پروفیسر ہو گئے ۱۸۵۷ء میں میرٹھ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے، مسٹر بٹلر (پرنسپل) ان سے واقف تھے ان کا بیان ہے کہ ذوالفقار علی ذہین اور طبّاع ہونے کے علاوہ فارسی اور مغربی علوم سے بھی واقف تھے"

پنشن پانے کے بعد دیوبند میں آنریری مجسٹریٹ رہے۔ وہ دارالعلوم کے بانیوں میں سے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں انتقال ہوا۔

یہ ساری تفصیل اس گھرانہ کے علمی پس منظر کو پیش کرنے کے لئے بیان کی گئی۔ جس میں مولانا محمود حسنؒ نے آنکھیں کھولی تھیں مولانا کے علمی اور اسلامی مزاج کی تشکیل میں اس خاندانی روایت نے اہم کردار انجام دیا ہے۔

مولانا محمودؒ کے علاوہ مولانا ذوالفقار علیؒ کے تین صاحب زادے اور تھے۔ یہ ان سے چھوٹے تھے۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ مدرس و طبیب دارالعلوم دیوبند مولانا حامد حسن صاحبؒ، مولوی حافظ محمد محسن صاحبؒ۔ دو صاحبزادیاں تھیں۔ ۱۸۵۷ء میں آپ کے والد کا تبادلہ میرٹھ ہو گیا۔

تعلیم: مولانا محمود صاحب چھ برس کے ہوئے تعلیمی سلسلہ کا آغاز ہوا۔ ان کے پہلے استاد میاں جی منگلوری تھے۔ ان سے قرآن کریم کے بیشتر سپارے پڑھ لئے تھے۔ میاں جی عبداللطیف سے قرآن پاک مکمل کیا اور ابتدائی فارسی پڑھی، عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے چچا مولانا مہتاب علی سے پڑھیں وہ بھی مولانا مملوک علی (دلی کالج) کے شاگرد تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں یہ خاندان کبھی میرٹھ اور کبھی دیوبند رہا۔ جس زمانہ میں آپ عربی کی کتابیں تہذیب اور قدوری وغیرہ پڑھ رہے تھے اسی زمانہ میں یعنی ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو دیوبند میں چند بزرگوں نے اسلامیات کی تعلیم کا ایک مدرسہ (دارالعلوم) شروع کیا۔ یہ مدرسہ دیوبند کی قدیم مسجد "مسجد چھتہ" کے فرش پر ایک انار کے درخت کی ٹہنیوں کے سایہ میں شروع ہوا تھا اس کے سب سے پہلے مدرس ملا محمود تھے۔ اور سب سے پہلے شاگرد یہ ہونہار محمود تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۵ برس تھی۔ درسیات کی بیشتر کتابیں یہیں مکمل کیں۔ کتب صحاح ستہ اپنے استاذ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے دلی، میرٹھ، دیوبند اور نانوتہ میں رہ کر پڑھیں ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں جلسہ دستار بندی میں آپ کو دستار فضیلت سے سرفراز کیا گیا۔ آپ کا شمار ذہین طلبا میں ہوتا تھا۔ اس لئے زمانہ طالب علمی میں ۸۹-۱۲۸۸ھ میں آپ معین المدرسین بنائے گئے۔ شوال ۱۲۹۴ھ میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور دیگر بزرگوں کے ساتھ آپ سفر حج پر تشریف لے گئے۔

❁

دیگر حالاتِ سیرت و اخلاق

مسندِ تدریس پر: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ایک جلیل القدر عالم، مفسر اور محدّث تھے۔ زمانہ طالب علمی ہی میں انھیں معین المدرسین مقرر کر دیا گیا تھا۔ ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں مدرس چہارم کی حیثیت سے آپ کا تقررِ عمل میں آیا۔ آپ بتدریج ترقی کے منازل طے کرتے گئے۔ ۱۳۰۸ھ میں مولانا سید احمد دہلویؒ کے مستعفی ہو جانے پر حضرت شیخ الہندؒ کو صدر مدرس بنا دیا گیا اس دوران میں آپ حج کو بھی تشریف لے گئے تھے۔ آپ نے ایک طرف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے خاص باطنی فیوض حاصل کئے تھے دوسری طرف اسی حج کے زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ قدّس سرّہ سے شرف بیعت حاصل کیا۔ بعد ازاں خلافت حاصل ہوئی۔ دار العلوم میں صدر مدرس کا مشاہرہ اس وقت ۷۵ روپے تھا مگر آپ نے ۵۰ روپے سے زیادہ کبھی قبول نہیں فرمایا۔ باقی ۲۵ روپے دار العلوم کے چندہ میں شامل فرما دیتے تھے حضرت شیخ الہندؒ کے حلقہ درس کی خصوصیات مولانا میاں اصغر حسینؒ نے اس طور پر بیان کی ہیں۔

"حلقہ درس کو دیکھ کر سلف صالحین و اکابر محدثین کے حلقہ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ قرآن و حدیث حضرت کی زبان پر تھا۔ اور ائمہ اربعہ کے مذاہب ازبر۔ صحابہ و تابعین۔ فقہا و مجتہدین کے اقوال محفوظ . . . . . نہایت ٹُبک

اور سہل الفاظ با محاورہ اردو میں اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ دریا امنڈ رہا ہے۔"

آپ تاحیات دارالعلوم کی مسند صدارت پر فائز رہے۔

سیاست اور قید و بند: یوں تو شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے ہوش سنبھالتے ہی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اور خفیہ انقلابی تحریک کی بنیاد ڈال دی تھی۔ لیکن آپ کی سیاسی سرگرمیوں میں زور اس وقت شروع ہوا جب ۱۹۱۲ء میں مشرقی یوروپ کی طاقتوں نے ایک طرف بلقان پر حملہ کر دیا۔ دوسری طرف اٹلی نے ترکی کے زیر نگیں علاقہ ٹریپولی (لیبیا۔ طرابلس) پر حملہ کر دیا۔ فرانس نے مراکش پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ خلافت ترکیہ سخت خطرہ میں پڑ گئی۔ اسی زمانہ میں حضرت شیخ الہندؒ نے مسلح انقلاب کا منصوبہ تیار کیا۔ ان سب کی تفصیل دوسرے ابواب میں بیان کی گئی ہے۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو آپ سفر حجاز کے لئے روانہ ہو گئے۔ آپ کو حجاز میں شریف حسین والیٔ مکہ نے گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالہ کر دیا انگریزوں نے مالٹا میں نظر بند کر دیا۔ جہاں آپ اور آپ کے رفقاء تقریباً پونے چار سال قید و بند کی زندگی گذار کر جون ۱۹۲۰ء میں وطن واپس تشریف لائے ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو اس دار فانی سے کوچ کیا اس طرح آپ نے ۱۸۷۱ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد سے اپنی وفات تک کامل ۵۰ برس تک سیاسی انقلاب لانے کی کوشش میں گذارے ملک کی جنگ آزادی کی تاریخ میں اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔

رحلت: جون ۱۹۲۰ء میں مالٹا کی نظر بندی سے رہائی کے بعد۔ شیخ الہندؒ ہندوستان تشریف لائے تو گویا مرض الوفات کا آغاز تھا۔ مالٹا کے سرد ترین موسم۔ حضرت کی شب بیداری۔ پیرانہ سالی۔ خوراک میں کمی اور

ان سب پر مستزاد ترکوں کی شکست اور اپنی جدو جہد کی ناکامی نے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ جوڑوں کا درد تو پہلے ہی تھا۔ اب تپ دق کا آخری اسٹیج تھا۔ اکتوبر میں آپ جامعہ ملیہ کا افتتاح کرنے کے لئے جب علی گڑھ تشریف لے گئے تھے تو شدید بیمار تھے۔ دیوبند واپس آنے کے بعد حالت زیادہ تشویشناک ہوگئی علاج کے لئے دہلی لے جایا گیا۔ وہاں ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ نے اپنی کوٹھی واقع دریا گنج میں رکھ کر خود اپنی نگرانی میں علاج کرایا یہیں ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو بروز منگل آپ نے وفات پائی۔ دلّی میں دو جگہ نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ جنازہ دیوبند لے جایا گیا۔ میرٹھ اور مظفر نگر کے اسٹیشن پر نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ آخر میں دوسرے روز دیوبند میں نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ اور تدفین عمل میں آئی اس موقعہ پر مولانا محمد علیؒ نے روتے ہوئے فرمایا "شیخ الہندؒ کی وفات نے کمر توڑ دی"

آپ کی وفات پر وابستگان، عقیدتمندوں اور شاگردوں نے بے شمار قصائد اور مرثیئے عربی، فارسی اور اردو میں لکھے، مولانا سراج احمد نے ایک طویل قطعہ وفات کہا۔ اس کا صرف ایک شعر جس سے تاریخ نکلتی ہے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

سال رحلت پہ ہوا غیب سے دل میں القا
خلد اعلیٰ طرب افزا ہے مقام محمود

۱۳۳۹ھ

حضرت شیخ الہند کی اہلیہ محترمہ کا انتقال۔ مالٹا سے حضرت کی واپسی کے بعد ہوا۔ جس وقت آپ حجاز شریف کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ اہلیہ نے پوچھا۔ مجھے کس پر چھوڑے جا رہے ہے۔ حضرت نے جواب دیا۔ خدا کے سپرد کیا۔ خداوند تعالیٰ نے ان کی اہلیہ کی موت ان کے سامنے مقدر کر رکھی تھی۔ حضرت کے اولاد نرینہ نہیں

تھی۔ ایک صاحب زادہ کا بچپن میں انتقال ہوگیا تھا۔ چار صاحب زادیاں تھیں۔ ان سب کی شادیاں حضرت شیخ الہندؒ کے حسب مزاج انتہائی سادگی اور اتباع سنت کے ساتھ عمل میں آئی۔

عظیم شخصیت: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اپنے دور کے علامہ ابن تیمیہ تھے جنھوں نے ایک طرف علوم اسلامی اور اشاعت دین کی خدمات انجام دیں اور دوسری طرف راہ حق میں جہاد بھی کیا۔ علامہ جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، شیخ احمد سنوسی، مہدی سوڈانی کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے لیکن مجموعی حالات پر نگاہ کر کے جب ہم حضرت شیخ الہند کی شخصیت پر نگاہ ڈالتے ہیں، وہ ہمیں سب سے بلند قامت نظر آتے ہیں چونکہ جن نامساعد حالات میں انھوں نے اپنے دور کی عظیم ترین سلطنت سے ٹکر لی اور جس ثبات قدمی اولوالعزمی تدبر اور سیاست سے کام لیا۔ اس کی مثال ماضی قریب میں نہیں ملتی تھی۔ ہندوستان میں اس وقت آزادیٔ کامل کا کوئی تصور نہیں تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس اگرچہ قائم ہو چکی تھی۔ لیکن اس کا دائرہ کار ابھی چند مطالبات اور شکایتوں سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ برطانیہ کو حدِ نظر تک چیلنج کرنے والی کوئی طاقت نہیں تھی۔ ان حالات میں حضرت شیخ الہندؒ نے عظیم برطانوی سلطنت کے تسلط سے ملک کو آزاد کرانے کا ایک ہمہ گیر منصوبہ بنایا اور عملی اقدامات کیے۔

جنگ حرّیت کے عظیم راہنما اور مفکّر اسلام مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں:

"سنہ ۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ مجھے خیال ہوا۔ ہندوستان کے علما و مشائخ کو عزائم و مقاصد وقت پر توجہ دلاؤں۔ ممکن ہے چند اصحاب رشد و عمل نکل آئیں چنانچہ میں نے اس کی کوشش کی لیکن تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سب کا متفقہ جواب یہی تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے۔ یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسنؒ

علم وفضل اور عاجزی: حضرت شیخ الہندؒ کو عاجزی و انکساری اپنے اساتذہ سے ورثہ میں ملی تھی۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور دوسرے اکابر دیوبند۔ باوجود انتہائی علم وفضل کے۔ عاجزی و انکساری کا مجسمہ تھے حقیقت یہ ہے کہ کم مایہ، تہی علم اور معمولی صلاحیت رکھنے والے ہی خود کو بڑا عالم فاضل گردانتے ہیں اور خود فریبی کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن علم وفضل میں جو جتنا گہرا ہو گا۔ وہ خود کو ہمیشہ حقیر اور عاجز گردانے گا۔ چونکہ اس کی نگاہ منازل بالا پر ہو گی۔ اور اپنی طے کردہ منزلیں حقیر معلوم ہوں گی۔ عظیم سائنسداں اسحٰق نیوٹن نے کائنات کے متعلق اپنے علم کی مثال اس طرح دی تھی کہ جس طرح سمندر میں کوئی چڑیا اپنی چونچ سے ایک قطرہ پانی پی لے۔ علم وفضل کے ساتھ اگر غرہ پیدا ہو جائے اور نفس غرور کا شکار ہو جائے تو ایسا علم وفضل شخصیت کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے نفس کی عاجزی اور انکساری کو جو ایک باطنی کمال ہے اور صوفیائے کاملین کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔ شخصیت پر اسی طرح کام کرتی ہے۔ جیسے سونے پر سہاگہ۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے شاگرد اور جانشین شیخ الاسلام مولانا حسین احمدؒ مدنی سفر نامہ شیخ الہند میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اس نے فقط باطنی فیوضات کے لئے ہر قسم کے ضبط سے کام نہیں لیا۔ بلکہ علوم ظاہریہ میں بھی باوجود مجدد حدیث وفقہ و امام تفسیر وکلام وغیرہ ہونے کے کبھی اپنے آپ کو دفتر علماء میں شمار نہ ہونے دیا۔ اس کی کسی حالت اور کسی عملی کارروائی سے کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ اپنے آپ کو عالم اور ہادی خلق یکتائے زمانہ شمار کرتا ہے اس نے حس فروتنی اور کسر نفسی سے اپنی زندگانی گذاری ہے وہ اہل اللہ میں بھی خاص خاص لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ہم نے مولانا کے

معاصرین اور اساتذہ کو دیکھا ہے۔ بلکہ خود ان کے ان معاصرین کو جنھوں نے
مولانا کے اکثر، بلکہ جملہ اساتذہ اور مشائخ کو دیکھا تھا کہ فروتنی اور کسرِ نفسی میں
تو مولانا اپنے زمانہ کے جملہ علما تو درکنار اپنے جملہ اساتذہ سے بھی سبقت لے گئے
پھر کوئی فرد بشر اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا مرحوم کی جملہ حرکات و سکنات
للّٰہیت اور اخلاص پر مبنی تھیں۔ اغراض و نفسانیت کا ان میں نام و نشان بھی نہ
تھا وہ تو حسب قاعدہ نبویہ "مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ"۔ جس نے اللہ کے لئے
فروتنی اختیار کی۔ اس کو اللہ تعالیٰ بلند کرے گا۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی
کیسی اور کتنی علو شان کہ بارگاہ ربّ العزت میں پتہ چلتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں
کہ جو کچھ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوا وہ سب کچھ حضرت مولانا نانوتوی اور
مولانا گنگوہی قدس اللہ اسرارھما کا ہی فیض تھا، مگر حسن قابلیت اور مبدء فیاض
کے کرم نے نہایت ہی عجیب، عدیم النظیر شگوفہ بنا دیا تھا۔ اس قلب کو جس
طرح خداوند کریم نے وسعت عطا فرمائی تھی اسی طرح تحمل اور حوصلہ اس قدر
عطا فرمایا تھا کہ واقف احوال دنگ رہ جاتا تھا۔ لوگوں کے وہ عیوب و احوال
جن کو بڑا حلیم الطبع دیکھ کر آپے سے باہر ہو جائے مولانا کی جبیں پر تغیر بھی پیدا
نہیں ہونے دیتے تھے۔ معصیت خداوندی میں تو دوسری حالت تھی۔ مگر غیر
معصیت اور اصلاح خلق میں اور علیٰ ہٰذا القیاس تکالیف و آزار کے برداشت
کرنے میں وہ ایک نہایت بلند پہاڑ تھے کہ جن کو نہ زلزلہ ہلا سکتا ہے نہ
بجلی گرا سکتی ہے۔ فطرت نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دل و دماغ کو ذکاوت
اور حفظ کا بھی وہ اعلیٰ درجہ عنایت فرمایا تھا جس کی نظیر وہ آپ ہی آپ تھے
جب کبھی کسی نے شعر و سخن میں مولانا سے مذاکرہ کیا ہے تو اس قدر اردو،
فارسی اور عربی کے اشعار اس کو سننے پڑے ہیں کہ اس کو سوائے حیرانی کے اور

کوئی چیز ہاتھ نہیں آتی۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ قدرت نے موزونیت طبع وہ عطا فرمائی تھی کہ کھرے اور کھوٹے کو خوب پہچانتے اور اس میں تمیز کامل فرماتے تھے، وہ اعلیٰ درجہ کے اشعار تالیف فرماتے تھے کہ طبقہ علمار تو درکنار حذّاق شعرا بھی عش عش کرجاتے تھے"

حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ "حیات شیخ الہندؒ" میں فرماتے ہیں۔

"ظاہر داری اور کسر نفسی سے نہیں بلکہ واقعی طور پر حضرت اپنے آپ کو نہایت حقیر اور ادنیٰ مسلمان سمجھتے تھے اور شان عبدیت کے غلبہ سے اپنے تمام کمالات ہیچ نظر آتے تھے"

اتباع شریعت اور توکل:

"حیات شیخ الہندؒ" کے مصنف مولانا سید اصغر حسین نے اپنے شیخ کی زندگی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"کوئی قول و فعل خلاف شریعت ہونا تو درکنار مدتوں خدمت میں رہنے والے خادم بھی نہیں بتلا سکتے کہ کوئی ادنیٰ سا فعل بھی آپ سے خلاف سنت سرزد ہوا دن ہو یا رات، صحت ہو یا مرض، سفر ہو یا حضر، خلوت ہو یا جلوت، ہر حالت میں حضرت کو اتباع سنت کا خیال تھا ـــــ غرض چلنا پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، سونا، جاگنا، جو کچھ بھی کمال اتباع کے ساتھ تھا۔

مہمانوں کی خدمت خود فرماتے۔ کبھی کھانا زنانہ مکان سے لاکر مہمانوں کے سامنے رکھتے۔ عشا کے بعد کھڑے ہیں اور سب کی ضروریات کو دریافت فرما رہے ہیں۔ خادم اور مہمان شرم سے پانی پانی ہوئے جاتے ہیں۔ اور حضرت مکان سے بستر اور لحاف اٹھا کر لا رہے ہیں۔ اتفاقیہ کہیں قیمتی کپڑا میسر ہو گیا تو وہی پہن رکھا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ موجود ہو تو اس میں بھی عار نہیں ـــــ مالٹا کے سفر سے

پہلے بھی دیسی کپڑے زیادہ پسند فرماتے تھے۔ اور اب آخری زمانہ میں تو اس طرف نہایت ہی توجہ ہو گئی تھی۔

"حضرت مولانا کا توکّل اور اعتماد علی اللہ اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ظاہری سامان معیشت اگر موجود بھی نہ ہوتے تو آپ کو کوئی پریشانی نہ ہوتی ـــ بہت دفعہ قرضدار رہنے کی نوبت آجاتی۔ تحفہ و نذر بہت کم اور کسی بہت ہی مخلص کے اصرار سے قبول فرمالیتے تھے۔ حضرات کے خدام راوی ہیں کہ بعض لوگ کئی کئی نوٹ پیش کرتے تھے تو حضرت کھول کر بھی نہیں دیکھتے تھے کہ کتنے روپے کے نوٹ ہیں۔ اسی طرح کبھی تکیہ کے نیچے رکھ دیتے کبھی پکار کر مولوی عزیز گل کے سپرد کر دیتے

اپنے خور و نوش میں حضرت مولانا نے تمام عمر کبھی تکلف و اہتمام نہیں فرمایا۔ کھانا وقت پر جیسا موجود ہوا نہایت شوق و رغبت سے تناول فرمایا۔ مکان پر اور ضیافت وغیرہ میں اگر عمدہ سے عمدہ کھانا ہوتا تو اس کو بھی بلا تکلف کھا لیتے۔ نہ کچھ زیادہ اظہار رغبت ہوتا۔ نہ زہد ریائی کے طریقہ پر اظہار کراہت اور ادنیٰ درجہ کا کھانا خصوصاً دوسروں کے مکان پر ایسی رغبت سے تناول فرماتے کہ دیکھنے والے کو گمان ہوتا کہ مولانا کو یہ چیز نہایت مرغوب ہے۔ مکان کے اندر کھانے کا اگر کبھی اتفاق ہوا تو بلا کسی امتیاز کے بے تکلف کسی جگہ بیٹھ کر کھانا کھا لیتے ـــ قرآن مجید اور احادیث سے جن چیزوں کی فضیلت اور تعریف ثابت ہوتی ہے ان کو بہت کثرت سے استعمال فرماتے۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سرکہ کو نعم الادام (عمدہ سالن) فرمایا گیا ہے۔ اس لئے سرکہ یا چٹنی اگر دسترخوان پر ہوتا تو سب چیزوں کی طرف سے اس کی طرف رغبت زیادہ فرماتے، جناب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر شام میں پنیر تناول فرمایا تھا۔ یہ حضرت مولانا کے مرغوبات میں شامل تھا۔

❁

تحریک سے پہلے

اس سے پہلے کہ ہم حضرت شیخ الہندؒ کی انقلابی تحریک کو سمجھیں ہمیں اس کا پس منظر جاننے کے لئے چند تاریخی و سیاسی احوال جاننے ہوں گے تاکہ ہم اس انقلابی تحریک کا اچھے ڈھنگ سے جائزہ لے سکیں اور اس کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔

سنہ ۱۴۹۸ء میں جب پہلے یوروپین واسکوڈاگاما نے ہندوستان کی سرزمین کالی کٹ پر قدم رکھا تو اس ملک کے باشندوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ پرتگیزی اور بعد میں آنے والے دوسرے یوروپی سوداگر اس قدر عیار اور ٹھگ ثابت ہوں گے کہ وہ اس ملک کی دولت کو نہ صرف دونوں ہاتھوں سے لوٹیں گے بلکہ اس پر قبضہ بھی کرلیں گے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں جب یوروپین قوموں نے نئی سرزمینوں کی کھوج کا آغاز کیا تو ان کے سامنے کوئی سائنسی تحقیقات یا اپنی تجارت کو فروغ دینے کا مقصد نہیں تھا۔ بلکہ لوٹ مار کے لئے شکار گاہوں کی تلاش ان کا مقصد تھا۔ پرتگیزیوں نے طویل مدت تک جنوبی ہند میں لوٹ مار جاری رکھی۔ پھر گوا اور اس کے آس پاس کے علاقہ میں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انگریز بعد میں آئے ۱۷ ویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کے نام پر ہندوستان آئی۔ بعد میں یہ کمپنی ملک کی سیاست میں دخیل ہوتی گئی۔ ان کا اندرونی مقصد بھی لوٹ مار اور اس ملک پر اپنا تسلّط قائم کرنا تھا۔ اس لئے کمپنی نے اپنے ایڈمنسٹریشن کو سرے ہی سے حکومت کے طرز پر قائم کیا۔

مغل حکومت اس وقت کمزور تھی آخری طاقتور اور با اختیار مغل فرمانروا اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال فروری ۱۷۰۷ء میں ہوا۔ اس کے بعد دلّی کی مغل بادشاہت کی تاریخ کمزوری، زوال اور مایوسی کی تاریخ ہے ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک تخت دہلی پر دس۱۰ تاجدار بٹھائے گئے ان میں سے صرف چار اپنی طبعی موت مرے۔ باقی ماندہ قتل کیے گئے۔

غیر ملکی تسلّط کے خلاف ملک میں غم و غصّہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر ہندوستان کی جنگ آزادی کی مکمل تاریخ لکھی جائے تو اس کا آغاز بنگال کے نواب سراج الدولہ سے کرنا ہوگا۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے جو ابتدائی "خود مختار علاقے" تھے ان میں ہوگلی اور کلکتہ بھی شمار ہوتے تھے۔ بنگال و بہار کے صوبیدار نواب سراج الدولہ ۱۷۵۶ء میں تخت پر بیٹھے۔ انگریز انھیں پہلے ہی اپنے اقتدار کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کے میدان میں دونوں فریقوں میں جنگ ہوئی۔ لیکن امیروں کی سازش خصوصاً میر جعفر کی غدّاری سے سراج الدّولہ کو شکست ہوئی۔ انگریز نے میر قاسم کو بنگال کا حاکم بنا دیا۔ لیکن ان سے بھی نباہ نہ ہو سکا میر قاسم نے ۱۷۶۴ء میں دلّی کے مغل بادشاہ شاہ عالم اور اودھ کے نواب شجاع الدّولہ کی مدد سے میر قاسم نے انگریزوں کی فوج سے بکسر کے مقام پر جنگ کی لیکن شکست ہوئی۔ اب بنگال مکمل طور پر انگریزوں کے قبضہ میں آگیا شاہ عالم اور شجاع الدولہ نے انگریزوں سے صُلح کر لی، بادشاہ نے ۲۶ لاکھ روپے سالانہ پر بہار اور بنگال کی دیوانی انگریزوں کے سپرد کر دی اس طرح دلّی میں بھی انگریزوں کا اثر قائم ہو گیا ادھر جنوب میں انگریزوں کے عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ میسور کا ٹیپو سلطان تھا۔ ٹیپو سلطان اور ان سے پہلے ان کے باپ حیدر علی سے انگریزوں نے کئی جنگیں لڑیں۔ ۱۷۹۲ء میں میسور کی چوتھی لڑائی میں ٹیپو سلطان کو اپنوں کی

غداری کے باعث شکست ہوئی۔ ٹیپو سلطان بہادری سے لڑتا ہوا شہید ہوا۔

شاہ ولی اللہؒ کی تحریک: ۱۸ویں صدی عیسوی میں ایک بہت بڑے مسلم مفکرؒ اور جلیل القدر عالم نے جنم لیا۔ ان کا نام نامی شاہ ولی اللہؒ تھا۔ آپ ۱۰ فروری ۱۷۰۳ء کو پیدا ہوئے اس کے چار برس بعد ہی عالمگیر کا انتقال ہوا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد شاہ ولی اللہؒ نے ایک طرف مغل بادشاہت کا زوال، دوسری طرف اہل فرنگ کے بڑھتے ہوئے اثرات کا مشاہدہ کیا۔ سلطنت اور ملک کی کمزوری کا جائزہ لیا اور علاج تجویز کیا اس سلسلہ میں شاہ ولی اللہؒ نے کچھ اصول مرتب کئے۔ اس سلسلہ میں ان کی کتابیں حجۃ اللہ البالغہ تفہیمات الٰہیہ، اور البدور البازغہ قابل ذکر ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے جو اقتصادی اور ملکی اصول بیان کئے ہیں وہ ایک طرف ملکی اتحاد اور متحدہ قومیت کی اساس ہیں تو دوسری طرف عام انسانی فلاح پر مبنی ہیں۔ شاہ صاحبؒ ۱۸ویں صدی میں وہ اصول بیان کر رہے ہیں، جو ۱۹ویں صدی کے نصف پر برطانیہ میں کارل مارکس اور اس کے دست راست انجلز نے بیان کئے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شاہ صاحبؒ کو خیالات کی اشاعت کے لئے نہ تو اشاعت کے جدید ترین طریقے اور نہ بیدار قوم نصیب ہوئی۔ دوسری طرف کارل مارکس کو وسیع پیمانہ پر نشر و اشاعت کے ذرائع میسر آتے اور بیدار ہوتے ہوئے یورپ کے پسماندہ طبقوں نے اس کے خیالات کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

شاہ صاحبؒ کے خیالات نے اگرچہ عمومی تحریک کی شکل اختیار نہیں کی لیکن ان خیالات کے نتیجہ میں جو جماعت ابھری۔ اس نے جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ غدر ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے اس جماعت نے فرنگی اقتدار کے خلاف نعرہ جہاد بلند کیا۔ اور عملی طور پر جہاد کیا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں بھی یہی جماعت

پیش پیش رہی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنے دور کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے سب سے پہلا اصول فَكَّ كُلِّ نِظَامٍ تجویز کیا۔ یعنی ہر نظام کو شکست دے کر اس میں انقلاب پیدا کرنا ـــــ اس کے بعد نئے نظام کی تعمیر ـــــ شاہ صاحب نے نئے نظام کے لئے یہ اصول تجویز کئے۔

سیاسی اصول:۔ ۱:۔ زمین کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اور ظاہری طور پر ریاست۔ باشندگان ملک بطور مسافر ہیں۔ ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ زمین سے فائدہ اٹھانے کا حق۔ دوسرے کی دخل اندازی ممنوع۔

۲:۔ تمام انسان برابر ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ اپنے آپ کو مالکِ مُلک، ملک الناس (لوگوں کا بادشاہ) قرار دے۔

۳:۔ ریاست کے سربراہ کی حیثیت ایک وقف کے متولی کی ہے۔ وہ اتنا ہی وظیفہ لے سکتا ہے جتنا کہ ایک متولی لے سکتا ہے۔

اقتصادی اصول:۔ ۱:۔ دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔

۲:۔ مزدور اور کاشتکار پیداواری قوت ہیں۔ جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لئے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

۳:۔ مزدور۔ کاشتکار اور جو لوگ ملک اور قوم کے لئے دماغی کام کریں دولت کے اصل مستحق ہیں۔ ان کی ترقی و خوشحالی ملک اور قوم کی خوشحالی ہے۔

۴:۔ جوا، سٹہ، اور عیاشی کے اڈے ختم کئے جائیں۔ ورنہ تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

۵:۔ جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے مزدوروں اور کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے وہ قوم کا دشمن ہے۔

۶:- ضرورتمند مزدور کی رضامندی قابلِ اعتبار نہیں جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امداد باہمی کے اصول کے طور پر لازم ہے۔

۷:- جو پیداوار اور آمدنی تعاون اور امداد باہمی کے اصول پر نہ ہو وہ خلاف قانون ہے۔

۸:- تعاونِ باہمی کا بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ تاجروں کے لئے جائز نہیں کہ وہ بلیک مارکیٹ یا غیر صحت مندانہ مقابلہ سے روحِ تعاون کو نقصان پہونچائیں

۹:- وہ کاروبار جو دولت کی صحیح گردش کو کسی خاص طبقہ میں منحصر کر دے ملک کے لئے تباہ کن ہے۔

۱۰:- شاہانہ نظام جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کے عیش و عشرت کے سبب سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل ہو۔ اسے فوری ختم کر دیا جائے۔

بنیادی حقوق اور رواداری:- شاہ صاحبؒ نے تمام باشندگانِ ملک کے لئے یکساں بنیادی حقوق اور مذہبی رواداری کے لئے یکساں اصول تجویز کئے۔

۱:- روٹی، کپڑا، مکان ہر مذہب و نسل کے انسان کا پیدائشی حق ہے

۲:- مذہب، نسل یا رنگ کے کسی امتیاز کے بغیر عام اہل ملک کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف اور جان و مال کی حفاظت۔ عزت و ناموس کی حفاظت۔

۳:- زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر ایک فرقہ کا بنیادی حق ہے۔

۴:- دین اور سچائی کی اصل بنیاد ایک ہے اسے پیش کرنے والے ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں دین کے بنیادی اصول تمام فرقوں میں تقریباً تسلیم شدہ ہیں مثلاً خالق حقیقی کی عبادت، صدقہ و خیرات، البتہ عملی صورتوں میں اختلاف ہے۔

۵ - ساری دنیا کے سماجی اصول اور ان کا منشا و مقصد ایک ہے۔ مثلاً ہر مذہب اور فرقہ جنسی انارکی کو اخلاقی جرم سمجھتا ہے نکاح ضروری ہے۔

۶ - جہاد ایک مقدس فریضہ ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مقدس مقاصد کے حصول کے لیے انسان اپنے اندر جذبہ فدائیت پیدا کرے۔

قدرتی امر تھا کہ شاہ ولی اللہؒ کے ان خیالات کا اثر ان کی جماعت، حلقہ اور شاگردوں پر ہوتا۔ شاہ صاحبؒ نے حالات کا عقلی اور اسلامی تجزیہ کرنے کے بعد طاقت کے ذریعہ انقلاب کا نسخہ تجویز کیا گیا جو اس زمانہ کے عین مطابق تھا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کا فتویٰ: شاہ ولی اللہؒ کے فرزند اور جانشین شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے والد محترم کے مشن کو جاری رکھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے بڑھتے ہوئے فرنگی اقتدار کو دیکھ کر ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔ شاہ ولی اللہؒ کا انتقال ۱۷۶۳ء میں ہوا اس وقت شاہ عبدالعزیزؒ کی عمر ۱۷ برس تھی جب حالات بہت ابتر ہو گئے تو شاہ عبدالعزیزؒ نے ذیل کا فتویٰ دیا۔

"دریں شہر حکم امام المسلمین اصلا جاری نیست و حکم رؤسا نصاریٰ بے دغدغہ جاری است و مراد از اجرائے احکام کفر این است کہ در مقدمہ ملک داری و بندوبست رعایا از خراج و باج و عشور اموال تجارت و سیاست قطاع الطریق و سراق و فصل خصومات و سزائے جنایات کفار بطور خود حاکم باشند۔ آرے اگر بعضے احکام اسلام را مثل جمعہ و عیدین و اذان .... تعرض نہ کردہ باشند لیکن اصل الاصول این چیز ہا نزد ایشاں ہبا و ہدر است زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم می نمایند و ہیچ مسلماں یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں شہر و در نواح آں نمی تواند آمد برائے منفعت خود دا دین و مسافرین و تجار ممانعت نمی نمایند۔ اعیان

دیگر مثلاً شجاع الملک، ولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمی تو انداز یں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ ممتد است"۔

ترجمہ :۔ اس شہر میں مسلمانوں کے حاکم کی حکومت قطعاً جاری نہیں اور عیسائی حکام کا حکم بلا روک ٹوک جاری ہے۔ ملک داری، رعایا کا بندوبست جیسے ٹیکس محصولات، تجارت کے اموال سے محصولات، ڈاکوؤں اور چوروں کی سزا، تنازعات کے فیصلے ـــــ اور جرائم کی سزا کے امور اپنے ہاتھ میں لے کر کفّار حاکم بن گئے ہیں۔ اگرچہ بعض احکام اسلام مثلاً جمعہ وعیدین سے تعرض نہیں کرتے۔ لیکن ان کے نزدیک یہ چیزیں بے کار ہیں۔ چنانچہ یہ مساجد کو بلا تکلف ڈھاتے ہیں۔ ان سے اجازت لئے بغیر کوئی مسلمان یا ذمّی شہر یا مضافات میں نہیں آسکتا یہ اپنے فائدہ کے لئے مسافروں اور تاجروں کو آنے کی ممانعت نہیں کرتے۔ دیگر اشخاص مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے اس شہر سے کلکتہ تک نصاریٰ کی حکومت ہے۔

شاہ صاحبؒ نے تجویز کیا کہ یا تو ملک کے اندر جنگ آزادی شروع کر دیں۔ یا ملک کی سرحدوں سے نکل کر جنگی ہیڈ کوارٹرز قائم کریں۔ ادھر ہزاروں نوجوان جہاد کے جذبہ سے سرشار ان کے اردگرد اکٹھے ہو گئے تھے۔

مجاہدین کی جماعت : حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ بریلوی ۱۸۱۶ء میں شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں دلّی حاضر ہوئے شاہ صاحبؒ نے انھیں دیکھتے ہی کہا :

"کتاب رکھدو۔ خدا نے تم کو دوسرے کام کے لئے پیدا کیا ہے"۔

سید صاحبؒ نے کام شروع کر دیا۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے بھتیجے مولانا اسماعیل شہیدؒ کو ان کا دست راست قرار دیا۔ سید صاحبؒ نے ایک طرف

دلّی سے پٹنہ اور بنگال تک دوسری طرف شمالی ہند میں صوبہ سرحد تک ایک اصلاحی تحریک چلائی۔ اور مسلمانوں کو دین کی حقیقی روح سے آگاہ کیا۔ سید صاحب ؒ ۱۸۲۲ء میں حج کو چاٹگام سے تشریف لے گئے۔ چاٹگام تک کا سفر قافلہ کی شکل میں کیا۔ آپ جہاں بھی پہونچتے تھے لوگ جوق درجوق آپ ؒ کی نشستوں اور مواعظ میں شریک ہوتے تھے۔ سید صاحب ؒ نے اپنے وابستگان میں ایک طرح کی متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ جو شریعت کے عین مطابق تھی۔ ۱۸۲۰ء میں انھوں نے اپنے چار خلیفہ اور نائب مقرر کئے اور ایک قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ان پر مقرر کیا۔ ہر بڑے شہر میں مالیہ مقرر کرنے کے لئے کلکٹر مقرر کئے۔

۱۸۲۴ء میں سید صاحب ؒ نے اپنی اس متوازی حکومت کا صدر مقام آزاد قبائل کی سرزمین یاغستان (صوبہ سرحد) میں منتقل کر لیا۔ اس کے لئے آزاد قبائل میں پہلے سے کام ہو رہا تھا۔ ۱۸۳۰ء تک آزاد قبائل کی یہ حکومت اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ اس نے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ آزاد قبائل کی اس حکومت کا دار الخلافہ استھانہ تحصیل چارسدّہ کو بنایا گیا۔ ۱۰ جنوری ۱۹۲۷ء کو حکومت کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا۔ بیعت جہاد کے بعد اندرون ملک سے اس علاقہ میں مجاہدین کو بھیجا جاتا تھا۔ شمالی ہند کے اس خطہ میں اس علاقہ کی اہمیت یہ تھی اس کے عقب میں افغانستان اور دیگر اسلامی ممالک تھے وہاں سے بوقت ضرورت مدد مل سکتی تھی اور ادھر اندرون ملک تحریک وسیع پیمانہ پر کام کر رہی تھی۔ اگر یہ حکومت مستحکم ہو جاتی تو انگریزوں کے قدم کم از کم سارے شمالی ہند میں نہ جم پاتے۔ مگر بدقسمتی سے اس معاملہ میں فرنگی ڈپلومیسی کامیاب ہوئی۔ انگریزوں نے پنجاب کی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت سے اس کا تصادم کرا دیا۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ سید صاحب ؒ کی اس تحریک کا اصل مقصد انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلّط

کو روکنا تھا۔ آپ راجوں مہاراجوں اور سکھ حکومت کے ذمہ داروں کے نام اپنے خطوط میں یہ لکھ چکے تھے:

"خدا گواہ ہے ہمارا منشا نہ دولت جمع کرنا ہے نہ اپنی حکومت قائم کرنا، ہمارا ہمارا منشا یہ ہے کہ یہ بعید الوطن بیگانے (انگریز) جو تاجر بن کر آئے تھے اور اب "ملوک زمین و زماں" بن گئے ہیں ان کو وطن سے نکال دیں۔"

مجاہدین کے جوش و خروش اور جذبۂ حریت کے مقابلہ میں جب کچھ بس نہ چلا تو انگریزوں نے اپنی مکارانہ چالوں سے کام لیا۔ ان کے خلاف وہابی ہونے کا پروپیگنڈہ کر کے عوام کو برگشتہ کر دیا۔ اور ایک عام شورش پھیل گئی۔ عوام نے ہر مقام کے ذمہ دار افسروں کو شہید کر دیا۔ سید صاحبؒ اور مولانا اسمٰعیل صاحبؒ نے اپنی طاقت یکجا کی تو سکھوں کی فوجوں سے مقابلہ ہو گیا۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو یہ سانحہ پیش آیا۔ دونوں بزرگ میدان جنگ میں شہید کر دیئے گئے۔

تحریک زندہ رہی: تحریکیں اپنے رہنماؤں کی زندگی اور موت سے بے نیاز ہوتی ہیں۔ حضرت سید احمدؒ اور مولانا اسمٰعیلؒ کی شہادت کے بعد بھی آزاد علاقہ اور اندرون ملک بھی آزادی کی یہ تحریک زندہ رہی۔ مجاہدین چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ گئے یہ چھوٹے چھوٹے گروپ گوریلا جنگ کرتے رہے۔

ولی اللّٰہی خاندان کے ایک فرد مولانا نصیر الدینؒ ۱۸۴۰ء کے آغاز میں استھانہ پہونچے۔ اور انھوں نے جماعت مجاہدین کی کمان سنبھال لی۔ لیکن ایک ہی برس میں آپ راہی ملک عدم ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب انگریزوں نے غزنی کی فتح کے بعد کابل پر قبضہ کی ٹھانی تھی۔ لیکن افغان بندوقوں نے ان کی وہ تواضع کی تھی کہ دنیا کو اس المیہ کی خبر دینے کے لئے صرف ایک فوجی ڈاکٹر ڈرائیڈن بچا تھا۔ جو

کسی طرح جلال آباد پہونچ گیا تھا۔

آزاد علاقہ میں مولانا نصیر الدینؒ کے بعد کئی امیر مقرر ہوئے۔ اب علماء صادق پور (بہار) نے یہ کمان سنبھالی۔ ۱۸۵۲ء تک مولانا ولایت علیؒ ۱۸۵۸ء تک مولانا عنایت علیؒ ۱۸۶۰ء تک مولانا نور اللہؒ، ۱۸۶۲ء تک میر مقصود علیؒ مجاہدین کے امیر رہے۔ اس کے بعد مولانا عبد اللہؒ صادق پوری ۴۰ برس تک اس جماعت کے امیر رہے ان کی وفات پر ۱۹۰۲ء میں مولانا عبد الکریم نے زمام قیادت سنبھالی۔ آپ نے ۱۱ فروری ۱۹۱۵ء کو وفات پائی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی انقلابی تحریک کے زمانہ میں یہی امیر تھے۔ ان کے بعد مولانا عبد اللہؒ کے پوتے مولانا نعمت اللہؒ امیر ہوئے۔ ان کی شہادت کے بعد دوسرے پوتے مولانا رحمت اللہؒ اس منصب پر فائز ہوئے۔ جو ملک آزاد ہونے تک رہے۔

تحریک کی ناکامی کی متعدد وجوہ ہیں سب سے بڑا سبب ایسی باقاعدہ فوج کا نہ ہونا ہے جو انگریزوں کی تربیت یافتہ فوج سے ٹکر لیتی۔ دوسرا سبب اندرون ملک انگریزوں کے خلاف تیاری کی کمی تھی ـــــ تحریک آزادی جزوی طور پر کامیاب رہی۔ چونکہ انگریزی افواج کے لئے سرحد ہمیشہ خطرناک رہی اس لئے کافی تعداد میں فوج اس طرف رکھنی پڑتی تھی۔ آزادی کا چراغ درون خانہ جلتا رہا اور کئی مواقع پر اس نے فرنگی اقتدار پر کافی ضرب لگائی۔ اس کے بعد یہی جذبات غدر ۱۸۵۷ء کے عظیم واقعہ کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ یہ آزاد علاقہ فرنگی حکومت کے لئے کتنا بڑا دردِ سر تھا۔ اس کا اندازہ ڈاکٹر ولیم ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے اس اقتباس سے ہوگا۔

"میں ان ذلتوں، حملوں اور قتل و غارت کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ جو ۱۸۵۶ء میں سرحدی جنگ کا باعث ہوئے۔ اس دوران میں مذہبی جنونیوں نے

سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکساتے رکھا۔ ایک ہی بات سے حالات کا بڑی حد تک اندازہ ہو جائے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علٰحدہ علٰحدہ ۱۶ جنگی مہمات بھیجنے پر مجبور ہوئے جس سے فوج کی تعداد ۳۵ ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۶ء و ۱۸۶۰ء تک ان مہمات کی تعداد ۲۰ تک پہونچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی تعداد ۶۰ ہزار ہو گئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی ـــــ بہرحال جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا تو اس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں"۔

غدر ۱۸۵۷ء: غدر ۱۸۵۷ء کو بعض مورخوں نے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی قرار دیا ہے۔ حالانکہ پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ اور میسور میں سلطان ٹیپو کی انگریزی افواج سے جنگ بھی جنگ آزادی کی کڑی ہے ہاں غدر ۱۸۵۷ء کو ہم انگریزی اقتدار کے خلاف پہلی عام جدوجہد کہہ سکتے ہیں۔

غدر یعنی فوجی شورش کا آغاز ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ چھاونی سے ہوا بہت ہی جلد دلی، جھانسی، کانپور اور لکھنؤ اس شورش کے مرکز بن گئے۔ اس عوامی تحریک میں ولی اللٰہی جماعت نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ جنگ لال قلعہ کی رہنمائی میں لڑی گئی اس میں ہندو، مسلمانوں نے ایک ہو کر ملک کی آزادی کے لئے قربانیاں دیں۔

ولی اللٰہی جماعت نے یوپی کے علاقہ شاملی و تھانہ بھون میں انگریزی فوج سے ٹکر لی۔ اس دوران میں ایک عارضی انقلابی کمان تشکیل دی گئی تھی جو حسب ذیل تھی۔

حضرت حاجی امداد اللہؒ ـــــ امیر المومنین
حافظ ضامن صاحبؒ ـــــ امیر جہاد
مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ـــــ کمانڈر انچیف
مولانا محمد منیر صاحبؒ ـــــ مولانا محمد قاسمؒ کے نائب

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ــــــ وزیر لام بندی

عارضی طور پر اس جماعت کو کامیابی ہوئی۔ اس جماعت نے جنگ آزادی تھانہ بھون اور شاملی کے مورچہ پر لڑی۔ جنگ آزادی کی عام ناکامی کے ساتھ ساتھ اس مورچہ پر بھی مجاہدین کی جماعت ناکام ہوئی۔ اس معرکہ میں حافظ ضامن صاحبؒ شہید ہوئے۔ جب داروگیر شروع ہوئی۔ سید حسن عسکریؒ کو گنگوہ سے گرفتار کر کے سہارنپور لایا گیا اور گولی ماردی گئی۔ انگریزوں نے تھانہ بھون پر حملہ کر کے قصبہ کو تباہ و برباد کر ڈالا اور گھروں کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو مظفر نگر جیل میں رکھا گیا۔ بعد میں رہائی عمل میں آئی۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ نے ہندوستان سے مکہ معظمہ کی طرف ہجرت کی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ روپوش ہو گئے عام معافی کے اعلان کے بعد منظر عام پر آئے۔

انگریزوں نے برائے نام مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر پر بغاوت کا مقدمہ چلایا اور انھیں رنگون جلاوطن کر دیا۔ ستم ظریفی دیکھئے اس ملک کا جو "قانونی بادشاہ" تھا اس پر "بغاوت" کا مقدمہ چلایا گیا۔ اور جو غاصب تھے وہ جج اور حکمراں بن بیٹھے۔ انگریزوں کے خلاف اس جنگ آزادی کی عبرتناک سزا ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو دی گئی۔ خود کو مہذب اور شائستہ کہلانے والی قوم نے درندگی اور بربریت کا ریکارڈ توڑ دیا۔ مقصد یہ تھا کہ آئندہ کسی کو ان غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف گردن اٹھانے کی جرأت نہ ہو۔

مجموعی طور پر اس جنگ میں دو لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ ان میں ۵۱ ہزار علماء کرام تھے۔ ایڈورڈ ٹامس نے شہادت دی کہ صرف دہلی میں پانچ سو علماء کو پھانسی دی گئی۔ جامع مسجد دلی کو فوجی چھاونی میں تبدیل کر دیا گیا۔ مسجد کے صحن میں مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ گورے شہر کی گلیوں اور کوچوں میں پھیل گئے۔ عورتوں،

بچوں اور مردوں کو جہاں پایا قتل کر دیا ہر طرف گلیاں لاشوں سے بھر گئیں۔ ۲۷ ہزار عام مسلمان شہید ہوئے۔ دلّی میں مہینوں قتل عام جاری رہا۔ چاندنی چوک کوتوالی کے سامنے ایک حوض کے تینوں طرف پھانسیاں دی جاتی تھیں مرزا غالبؔ نے اسی کے بارے میں کہا ہے ع

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے　　گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہر دلّی کا ذرّہ ذرّہ خاک　　تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

ادھر پٹنہ اور کلکتہ کا بھی یہی حال تھا۔ گلی کوچوں میں ہر طرف لاشیں پڑی تھیں۔ پنجاب میں اور بھی بُرا حال تھا۔ باغیوں یعنی مجاہدین کو قطاروں میں کھڑا کر کے گولی مار دی جاتی تھی، یہ سب انگریز کمانڈروں کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے۔

"ہزاروں عورتیں فوج کے خوف سے کنوؤں میں گر پڑیں۔ یہاں تک کہ پانی سے اوپر ہو گئیں۔ جب زندہ عورتوں کو کنوؤں سے نکالنا چاہا تو انھوں نے کہا کہ ہمیں گولی سے مار دو نکالو نہیں۔ ہم شریفوں کی بہو بیٹیاں ہیں ہماری عزت خراب نہ کرو۔ بعض لوگوں نے اپنی عورتوں کو قتل کر کے خودکشی کر لی۔"

ہر ظالم اور متکبّر حکمراں کی طرح انگریزوں کا بھی یہی خیال تھا کہ ان انسانیت سوز حرکتوں اور درندگی کے مظاہرہ کے بعد محکوموں کو سر اٹھانے کی ہمت نہ ہو گی، لیکن قانون قدرت کچھ اور ہے اور آنے والے وقت نے ان کی طاقت اور شوکت کو بھی خاک میں ملا دیا۔

پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کی متعدد وجوہ ہیں لیکن یہاں چند کا ذکر کیا جاتا ہے

۱۔ انگریز جنگی فنون اور اسلحہ میں ہندوستانیوں سے آگے تھے۔ مجاہدین کے پاس نہ یہ ترقی یافتہ اسلحہ تھے۔ اور نہ ان جیسی تربیت کا انتظام۔

۲۔ دیسی ریاستوں پر دو ایک کو چھوڑ کر انگریزوں کا مکمل سیاسی کنٹرول تھا۔ یہ ریاستیں، انگریز کی مخالف صف میں نہیں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ اگر دو چار بڑی ریاستیں اس عام شورش میں کھڑی ہو جاتیں تو غدر کا نتیجہ یکسر مختلف ہوتا انگریزی غلبہ کا اندازہ اس سے ہو گا کہ جب غدر شروع ہوا تو بمبئی کے انگریز گورنر نے حیدر آباد کے انگریز ریذیڈنٹ کو تار دیا۔

IF NIZAM GOES INDIA GOES

ترجمہ: اگر نظام ہاتھ سے جاتا ہے تو ہندوستان ہاتھ سے نکل جائے گا

۳۔ مجاہدین آزادی کو جدید فنون کا کوئی علم نہیں تھا۔ انگریزوں کے پاس تار برقی تھا اور ریلوے سسٹم بھی کافی حد تک موجود تھا۔ آغاز جنگ میں اگر مجاہدین یہ دونوں چیزیں تباہ کر دیتے تو انگریزوں پر زبردست ضرب لگائی جا سکتی تھی۔ کمک پہونچنے میں دیر ہوتی۔

۴۔ مجاہدین کی باضابطہ سپلائی لائن نہیں تھی۔ نہ غیر ملکی امداد — ادھر کلکتہ سے اور جنوب میں مدراس اور ترچناپلی سے انگریزوں کی باقاعدہ سپلائی لائن تھی جو جنگ کے دوران میں برقرار رہی۔ اگر شمالی ہند سے انگریزوں کو دھکیل بھی دیا جاتا تو وہ جنوب اور شمال مشرق میں یکجا ہو کر اپنی طاقت دوبارہ اکٹھی کر لیتے چونکہ ان کی "سمندری سپلائی لائن" پھر بھی برقرار رہتی۔

۵۔ طاقتور قیادت کی کمی بھی مجاہدین کی ناکامی کا بڑا سبب تھا۔ بہادر شاہ ظفر جو برائے نام بادشاہ تھے۔ طاقتور اور بیدار مغز راہنما کے فرائض ادا نہ کر سکتے تھے انھیں صرف علامتی طور پر جنگ آزادی کا راہنما بنایا گیا تھا۔

۶۔ مجاہدین کے پاس سرے سے انٹلی جنس نظام موجود نہ تھا۔ جب کہ انگریز کا سارا کاروبار ہی کامیاب انٹلی جنس نظام پر مبنی تھا۔ خود لال قلعہ میں جو

مجاہدین آزادی کا مرکز تھا، یہ نظام موجود تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار کی لمحہ لمحہ کی خبریں انگریزوں کے پاس پہونچتی تھیں۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان پر برطانیہ کا مکمل تسلط ہو گیا اس طرح تقریباً اگلے سو برس تک ہندوستان ہی نہیں، مشرق کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ چونکہ ہندوستان ہی برطانیہ کی وہ سب سے بڑی نو آبادی تھی جس کے ذریعہ اور بل بوتے پر برطانیہ نے ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ملکوں کو غلام بنائے رکھا اور قوموں کو غلام بنانے کی یوروپین طاقتوں کی دوڑ میں سب پر غالب رہا۔

دار العلوم دیوبند کا قیام:

جیسا کہ بتایا گیا کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ گرفتاری سے بچ گئے تھے۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کچھ مدت کے بعد رہا ہو گئے تھے، چونکہ کوئی دستاویزی ثبوت ان کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ مولانا محمد قاسمؒ اور ولی اللہی جماعت کے بچے کھچے افراد نے دوسری دفاعی لائن اپنانے کا فیصلہ کیا چونکہ سیاسی اور جسمانی طور پر ہندوستان غلام ہو چکا تھا۔ اب قوت مزاحمت کا ایک ہی ذریعہ رہ گیا تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے دین وایمان کی حفاظت کریں۔ غدر ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے اس ملک کو عیسائی بنانے کے عزائم تھے۔ لیکن جب شدید قوت مزاحمت دیکھی تو برطانوی حکام نے یہ ارادہ چھوڑ دیا اور صرف ملک کو سیاسی طور پر غلام بنانے پر اکتفا کیا۔ البتہ اس ملک میں ایک ایسا طبقہ وجود میں لانے کی کوشش کی جو گوشت پوست اور جسموں کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو لیکن اس کے سوچنے کا ڈھنگ ایسا ہو جس سے انگریزوں کے سیاسی مقصد کی تکمیل ہوتی ہو۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حاجی عابد حسین اور دیوبند کی دیگر بڑی شخصیتوں نے ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو مسجد چھتہ کے فرش پر انار کے درخت کے نیچے اسلامی علوم

کے لئے درسگاہ قائم کی سب سے پہلے استاد ملاّ محمودؒ تھے۔ اور سب سے پہلے شاگرد مولانا محمود حسنؒ تھے۔ اس درسگاہ نے کچھ عرصہ کے بعد "دارالعلوم" کے نام سے عظمت حاصل کی۔ اس معاملہ میں پہل حاجی عابد حسینؒ کو حاصل ہے انھوں نے اس مدرسہ کے لئے خود چندہ دیا اور سب سے پہلے چندہ جمع کیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد یہ مدرسہ، ایک بڑی اسلامی یونیورسٹی کے نام سے مشرقی ممالک میں مقبول ہوگیا۔ بانی دارالعلوم مولانا محمد قاسمؒ نے دارالعلوم کے لئے کچھ اصول ہاتھ سے تحریر فرمائے تھے۔ وہ ابھی تک دارالعلوم اور مدرسہ شاہی مرادآباد کے ریکارڈ میں مصروف ہیں، ان کا لب لباب یہ ہے کہ مدرسہ کے لئے آمدنی کا کوئی مستقل سلسلہ نہ قائم کیا جائے۔ توکل پر گذارہ رہے چندہ عوام سے لیا جائے۔

ولی اللّٰہی جماعت نے اب مدرسہ کو اپنا مرکز بنالیا تھا۔ بانی دارالعلوم نے مدرسہ کے بنیادی قواعد اور نظام تعلیم اس ڈھنگ سے منظم کئے کہ جماعت کے دینی، اسلامی اور سیاسی مقاصد کی تکمیل ہوسکے۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے ایک بار حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسنؒ سے ان کے سیاسی مسلک کے بارے میں دریافت کیا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے جواب دیا۔

"حضرت الاستاذ (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے کہ ۱۸۵۷ء کی تلافی کی جائے ـــ آخر میں ارشاد ہوا کہ ـــ تعلیم و تعلم جن کا مقصد اور نصب العین ہے۔ میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں۔ لیکن خود اپنے لئے تو اسی راہ کا میں نے انتخاب کیا ہے جس کے لئے دارالعلوم کا نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا۔ (ماہنامہ "دارالعلوم" ۱۳۷۲ھ)

شیخ الہندؒ کی انقلابی تحریک

۱۹ویں صدی کے اخیر دور میں اور بیسویں صدی کے اوائل میں سلطنت برطانیہ اتنی وسیع ہوچکی تھی کہ اس کی حدود میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ افریقہ اور ایشیا کے بیشتر ممالک برطانیہ یا کسی دوسری یوروپین طاقت کے غلام بن چکے تھے۔
ان حالات میں جن محبِّ وطن ہستیوں اور جماعتوں نے مزاحمت کا آغاز کیا ان کا مرتبہ بلاشبہ بلند ترین ہے۔ اس لئے کہ مشرقی اقوام کی غلامی و درماندگی کے خلاف جذبہ سب سے پہلے ان کے دلوں میں پیدا ہوا۔

مصر و سوڈان پر بڑھتے ہوئے برطانوی اثرات کے خلاف محمد احمد ابن عبداللہ نے ۱۸۸۱ء میں انقلابی تحریک کی قیادت کی۔ مہدی کا لقب اختیار کیا۔ انگریزی اور مصری افواج کو شکست فاش دے کر اسلامی ریاست قائم کی جو بحر احمر سے لے کر وسطی افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۸۸۵ء میں مہدی کے انتقال کے بعد ان کے خلیفہ عبداللہ کے ہاتھ قیادت آئی۔ ۱۸۹۸ء میں برطانوی و مصری فوجوں کے مشترکہ حملہ نے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ ایران و افغانستان میں علامہ جمال الدین افغانی نے اپنے انقلابی خیالات سے سامراج کے خلاف رائے عامہ ہموار کی۔ علامہ افغانی نے ہندوستان اور مصر میں بھی اتحاد اسلامی کے جھنڈے تلے سامراج کے خلاف رائے عامہ بیدار کی۔ پیرس سے انھوں نے اپنے شاگرد مفتی محمد عبدہ کے ساتھ مل کر العروۃ الوثقیٰ رسالہ نکالا۔ اس میں

انقلابی خیالات کا پرچار ہونا تھا۔ یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ اس زمانہ کی بیشتر تحریکیں مدد اور حمایت کے لئے ترکی کی خلافت عثمانیہ کی طرف دیکھتی تھیں، چونکہ مشرق میں یہی ایک بڑی سلطنت تھی، جو یوروپین طاقتوں کے خلاف اہل مشرق کی مدد کرسکتی تھی۔

۸۲-۱۸۸۱ء میں مصر کے فوجی جنرل محمد اعرابی پاشا نے مصر میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے خلاف جنگ کی۔ یہ مصریوں کی قومی تحریک تھی۔ ایک طرف مصر کا بادشاہ خدیو توفیق پاشا، اس کی فوج اور انگریزی افواج تھیں۔ دوسری طرف عربی پاشا اور مصری عوام تھے۔ جنرل ولزلی اور امیر البحر سیمور کی سرکردگی میں انگریزی اور مصری فوج نے تل الکبیر کی جنگ میں اعرابی پاشا کو شکست دی۔ اعرابی پاشا کو سزا دے کر سری لنکا میں جلاوطن کر دیا گیا جہاں وہ ۱۰ جنوری ۱۸۸۳ء سے جولائی ۱۹۰۱ء تک نظربند رہے۔ اس تحریک میں شیخ محمد عبدہ ساتھ تھے انھیں بھی تین برس کے لئے جلاوطن کر دیا گیا۔ اس ہار سے مصر کی قومی تحریک پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ بڑھتی رہی۔ اس تحریک کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ خود توفیق پاشا کے محل کی بیگمات اعرابی پاشا کی فتح کی دعا مانگ رہی تھیں۔ ۲۰ویں صدی میں طرابلس (لیبیا) میں شیخ احمد سنوسی اور ریف (مراکش) میں امیر عبدالکریم نے سامراج کے خلاف انقلابی تحریکوں کی قیادت کی۔

ادھر ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں پوری طرح جکڑا ہوا تھا۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں برطانیہ جیسی درجہ اول کی طاقت سے ٹکر لینے کے لئے ایک منظم اور درجہ اول کی انقلابی تحریک کی ضرورت تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ کی انقلابی تحریک سے پہلے ہمیں کوئی بھی انقلابی تحریک نظر نہیں آتی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد

ہندوستان کی پہلی انقلابی تحریک یہی تھی۔ یوں اکا دکا انقلابی کوششیں کی گئیں ۱۹ ویں صدی کے اخیر اور ۲۰ ویں صدی کے آغاز میں "بنگالی انقلاب پسندوں" نے کچھ کوششیں کیں۔ لیکن شیخ الہندؒ کی تحریک اس سے بھی کہیں پہلے خفیہ طور پر اپنا کام کر رہی تھی۔ ۱۸۸۴ء میں وائسرائے لارڈ ڈفرن کے مشورہ سے مسٹر ہیوم نے انڈین نیشنل کانگریس قائم کی۔ جس کا واحد مقصد حاکموں اور محکوموں کے درمیان رابطہ پیدا کرنا تھا۔ کانگریس کافی مدت تک چند مطالبات اور شکایتوں سے آگے نہ بڑھی۔ اور نہ آزادی کا کوئی تصور شروع میں اس کے پاس تھا۔

شیخ الہند کی انقلابی تحریک اس تحریک کا ایک حصہ تھی جو ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے حضرت سید احمد شہیدؒ نے شروع کی تھی۔ تحریک میں کبھی رکاوٹ نہ پڑی۔ باقی ماندہ مجاہدین آزاد قبائل میں سرگرم رہے۔ مجاہدین کی کئی بستیاں آباد ہو گئیں۔ شیخ الہند نے اپنی تحریک کا مرکزی نقطہ اسی علاقہ کو بنایا۔ مالی وسائل، فوجی تربیت اور اسلحہ کی ترسیل کے ذریعہ ان مجاہدین کو زیادہ سے زیادہ منظم کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں کام کا جو ڈھنگ اختیار کیا گیا۔ اس کی تفصیل رولٹ کمیٹی رپورٹ (۱۹۱۸ء) ریشمی خطوط سازش کیس سے متعلق سی آئی ڈی رپورٹوں اور خود انقلابیوں کے اپنے بیانات سے ملتی ہے۔ یہاں یہ خیال رہے کہ انقلاب پسند حلف رازداری کے پابند ہوتے ہیں۔ زیادہ تر راز اپنے ہی سینے میں لے جاتے ہیں۔ لیکن وقت بیت جانے اور خطرہ ٹل جانے پر کچھ ظاہر بھی کر دیتے . . . ہیں۔ ریشمی خطوط سازش کیس سے متعلق سی آئی ڈی کا ریکارڈ لندن سے منگوا کر اس کا ترجمہ مولانا سید محمد میاںؒ نے اپنی کتاب تحریک شیخ الہندؒ میں شائع کر دیا ہے۔

تنظیمیں اور مراکز:۔ تحریک کا سب سے بڑا مرکز حضرت شیخ الہند مولانا

محمود حسنؒ کی شخصیت اور ان کا مکان تھا۔ دار العلوم دیوبند میں برصغیر بلکہ دوسرے ممالک کے طلبا بھی تعلیم کے لئے آتے تھے۔ انقلابی روح پیدا کرنے اور اتحاد اسلامی کی تحریک چلانے کے لئے اس سے موزوں اور کوئی مقام نہیں ہو سکتا تھا۔ دار العلوم ہی سے اس انقلابی تحریک کو کام کے آدمی ملتے تھے صوبہ سرحد کے طلبا اس معاملہ میں خاص طور پر مددگار ہو سکتے تھے۔ ان ہی کے ذریعہ آزاد سرحدی قبائل میں موجود مجاہدین کی جماعت سے مضبوط رابطہ قائم تھا۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے صلاح مشورہ سے ۱۸۷۸ء میں کام کا آغاز ایک تنظیم ثمرۃ التربیت سے کیا گیا۔ بظاہر یہ طلبا کی تنظیم تھی۔ اس کا اصل مقصد کام کے آدمیوں کی تیاری تھی۔ دو برس بعد تنظیم کے سرپرست مولانا نانوتویؒ کا انتقال ہو گیا تو یہ تنظیم بھی دم توڑ گئی۔ اس کے بعد ۳۰ برس تک حضرت شیخ الہند نے اپنی جماعت کے ساتھ انقلابی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۱۹۰۹ء میں ایک نئی تنظیم جمعیۃ الانصار قائم کی شیخ الہند نے اپنے شاگرد خاص مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو سندھ سے بلا کر نئی تنظیم کا کام ان کے سپرد کیا۔ مولانا سندھیؒ "ذاتی ڈائری" میں لکھتے ہیں۔

"حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبند طلب فرمایا۔ اور مفصّل حالات سنا کر دیوبند میں رہ کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا۔"

یہ تنظیم کافی موثّر اور باوزن تھی۔ اس کے بارے میں مولانا سندھیؒ لکھتے ہیں۔

"دار العلوم میں ایک ایسی حرکت پیدا ہوئی جس سے منتشر پروانے شمع کے گرد جمع ہونے شروع ہوئے۔ یہ جمعیۃ الانصار کی ابتدا ہے۔"

اس تنظیم کا پہلا تین روزہ اجلاس اپریل ۱۹۱۱ء میں مراد آباد میں ہوا۔ اس

میں علمارِ دیوبند کے علاوہ ندوہ، علی گڑھ کی اہم شخصیتوں نے بھی شرکت کی۔ اس کی صدارت حضرت شیخ الہندؒ کے رفیق مولانا احمد حسنؒ امروہی نے کی۔ ۱۹۱۲ء میں اس کا دوسرا اجلاس میرٹھ اور تیسرا اجلاس اگست ۱۹۱۳ء میں شملہ میں ہوا۔ اگست ۱۹۱۴ء کو جمعیۃ الانصار کا چوتھا اور آخری اجلاس شملہ میں ہی منعقد ہوا۔ لیکن اس میں تنظیم کے روحِ رواں مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے شرکت نہ کی۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی علیٰحدگی کا خاص سبب یہ تھا کہ اس تنظیم کی سرگرمیوں کو انگریز حکومت شک وشبہ سے دیکھنے لگی تھی۔ اربابِ اہتمام اور خود حضرت شیخ الہندؒ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس پر آنچ آجائے چنانچہ چند علمی مسائل پر مولانا سندھی اور دوسرے علما میں اختلاف پیدا کیا گیا اور اسے بہانہ بنا کر مولانا سندھی کو دار العلوم سے الگ کر دیا گیا اس کے بعد مولانا عبید اللہ سندھی دلی تشریف لے گئے۔

مولانا سندھی "ذاتی ڈائری" میں لکھتے ہیں۔

"حضرت شیخ الہند کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دلّی منتقل ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ اس کی سرپرستی میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے ــــ حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار برس دیوبند رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا اسی طرح دلّی پہونچ کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے دلّی تشریف لائے ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا محمد علی سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا"

دیوبند اور دہلی کے علاوہ برِ صغیرِ ہند کے مختلف مقامات پر اس انقلابی

تحریک کے مراکز تھے۔ ان میں قابل ذکر پانی پت، راندھیر (گجرات) ڈھاکہ، چکوال لاہور، دین پور امروٹ (سندھ) کراچی، سلمان زئی، ترنگ زئی یاغستان (آزاد قبائلی علاقہ) حیدرآباد (سندھ) اور کابل تھے۔ دیکھا جائے تو کابل تحریک کا خاص انقلابی مرکز تھا جہاں سے سرحدی مجاہدین کو ہر طرح کی مالی اور اسلحہ کی امداد پہونچائی جاتی تھی۔ بلکہ سیاسی سرگرمیوں کا بین الاقوامی مرکز بھی تھا۔

"سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں حضرت۔ شیخ الہندؒ کی تحریک کے خاص رکن تھے۔ وہ "آپ بیتی" میں لکھتے ہیں:" حاجی صاحب ترنگ زئی ایک سچے قوم پرست بزرگ تھے۔ ان کی سرپرستی میں گدر کے مقام پر ایک دارالعلوم قائم ہو گیا۔ جس کے مہتمم مولوی تاج محمد صاحب مقرر ہوتے اور اور مولوی فضل ربیؒ اور مولوی فضل محمود صاحب مخفی ان کے ساتھ کام کرنے لگے۔ میں نے اور مولوی عبدالعزیز صاحب نے ۱۹۱۰ء میں اتمان زئی میں ایک قومی اور اسلامی مدرسہ قائم کیا اس طرح ہماری کوششوں سے صوبہ بھر میں بہت سے مدرسے کھل گئے۔"

اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ مدارس خاص طور پر صوبہ سرحد میں اس انقلابی تحریک کے مراکز کے طور پر بھی کام کرتے تھے۔

ایک اور موقعہ پر خان عبدالغفار خاں ایک بیان میں یہ انکشاف کرتے ہیں "حضرت شیخ الہندؒ آزاد قبائل یاغستان میں ہمارے ذریعہ سے ایک مرکز قائم کرنا چاہتے تھے جس میں وہ خود بھی آکر شامل ہونا چاہتے تھے۔ اس غرض کے لئے میں نے اور مولانا فضل محمود نے آزاد قبائلی ریاستوں میں مرکز کے لئے موزوں مقام تلاش کرنے کے لئے انتہائی مشقتیں اٹھائیں۔ انگریزوں

کی نگرانی کافی سخت تھی اس کے باوجود ایک مرکز زیگی ریاست باجوڑ میں قائم کرنے میں کامیابی ہوئی۔ (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن ۶ جنوری ۸۵ء)

جہاں تک اسلحہ کا تعلق تھا۔ افغانستان میں اسلحہ کی خرید و فروخت پر کبھی پابندی نہیں رہی۔ چنانچہ کابل سے وسیع پیمانہ پر اسلحہ سرحدی علاقہ میں لایا جاتا تھا۔

تحریک کی وسعت :۔ اس تحریک میں ایک طرف حضرت شیخ الہندؒ کے ہم زمانہ علما اور راہنما شامل تھے دوسری طرف ان شاگردوں، مریدوں اور عقیدت مندوں کی بھاری تعداد موجود تھی۔ ریشمی خطوط سازش کیس سے متعلق سی آئی ڈی رپورٹ میں ۲۲۲ اشخاص کا ذکر ہے ۱۲۳ مشتبہ اشخاص کی فہرست ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً ۴۰۰ اشخاص تحریک سے متعلق تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعداد نامکمل ہے اس میں مجاہدین کی وہ تعداد شامل نہیں جو مستقل طور پر آزاد قبائلی علاقہ میں مقیم تھی ظاہر ہے کہ یہ تعداد ہزاروں میں رہی ہوگی۔ مختلف تربیتی مراکز میں تربیت کے بعد مجاہدین کو اس علاقہ میں پہونچا دیا جاتا تھا۔ پیغام رسانی کے مختلف ذرائع تھے۔ ایک ذریعہ ریشمی رومالوں پر خطوط لکھنے کا تھا۔ گلدانوں کے پھولوں میں بھی پیغام پہونچائے جاتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تحریک میں کامل رازداری برتی گئی۔ اور ایک خاص موقعہ کے سوا طویل مدت تک انگریزوں کی سی آئی ڈی کو اس تحریک کا پتہ نہ چل سکا۔

کابل کا مرکز :۔ حضرت شیخ الہند کی سیاسی فراست نے اپنی سیاسی و انقلابی سرگرمیوں کے لئے کابل کو پہلے ہی منتخب کر لیا تھا۔ چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے۔

"سنہ ۱۹۱۵ء میں شیخ الہندؒ رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا ..... کابل پہونچ کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس جماعت کے نمائندہ تھے۔ اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لئے تیار ہے ان کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا"۔ (ذاتی ڈائری)

مولانا عبید اللہ کی کابل میں سرگرمیوں کا تفصیلی تذکرہ خود مولانا سندھیؒ کی ذاتی ڈائری اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی کتاب نقش حیات میں کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کابل میں ہندوستان کی پہلی" عارضی حکومت ہند قائم کی گئی۔ جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ وزیر اعظم مولوی برکت اللہ بھوپالی اور وزیر اعظم امور ہند مولانا عبید اللہ سندھی تھے۔ اس زمانہ میں ترک اور جرمن مشن کابل آئے ہوئے تھے۔ انھیں ہندوستان کی جنگ آزادی کی صحیح پوزیشن سمجھائی۔ امیر افغانستان سردار حبیب اللہ خاں کو اپنا ہمنوا بنایا۔ دوسرے اراکین سلطنت کی تائید بھی حاصل کی۔

امیر صاحب نے جرگہ بلا کر انگریزوں سے جنگ کی رائے لی تو تمام ممبران نے جنگ کے حق میں رائے دی۔ اگرچہ خود امیر حبیب اللہ خاں انگریزوں سے جنگ نہ کر سکے لیکن بعد میں بننے والے امیر امان اللہ خاں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ آپ کا ہم خیال ہو گیا۔ اور انھوں نے افغانستان کی آزادی کا اعلان کر دیا اور جب افغان۔ برطانیہ جنگ ہوئی تو آپ نے تدابیر جنگ میں پورا حصہ لیا اور اپنے جنود اللہ (خدائی لشکر) کے تربیت یافتہ افراد

کو بھی جنگ میں شرکت کا حکم دیا یہاں تک کہ برطانیہ کو شکست ہوئی اس پر برطانیہ کے سفیرِ متعینہ کابل نے کہا تھا، یہ افغانستان کی نہیں عبید اللہ کی فتح ہے۔

کابل میں مولانا عبید اللہ سندھی نے جنود اللہ (خدائی لشکر) نامی فوج کی تشکیل کی، جس کے کمانڈر انچیف حضرت شیخ الہند متعین کئے گئے اور تحریک کے بہت سے ممبران کو ان کی سرگرمیوں کے مطابق مختلف فوجی عہدے دیئے گئے۔ کابل سے مختلف ممالک کو جن میں روس اور جاپان بھی شامل ہیں وفود بھجوائے گئے۔ رولٹ کمیٹی رپورٹ میں لکھا گیا ہے۔

"آزاد ہند حکومت نے روسی ترکستان کے گورنر اور زار روس کو خطوط بھیجے۔ جن میں اس سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے امداد و تعاون کی دعوت دی گئی تھی۔ ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط تھے۔ زار روس کو جو خط لکھا گیا تھا وہ سونے کی تختی پر تھا۔ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ترکی حکومت سے روابط قائم کئے جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے عبید اللہ نے اپنے پرانے دوست محمود حسن کو خطوط لکھے"۔

غلط سی آئی ڈی رپورٹ کی بنیاد پر مولانا محمود حسن کو مولانا عبید اللہ سندھی کا دوست لکھا گیا ہے۔ انگریزوں کے کارندوں کو اخیر تک پتہ نہ چلا کہ اس انقلابی تحریک کے پیچھے اصل راہنما حضرت شیخ الہندؒ ہیں۔

سیاسی تبدیلیاں:- سنہ ۱۹۱۲ء میں مشرقی یورپ کی طاقتوں نے برطانیہ کی درپردہ حمایت سے خلافت عثمانیہ کے بلقانی علاقوں پر حملہ کر دیا۔ ادھر اٹلی نے طرابلس (ٹریپولی۔ لیبیا) پر حملہ کر دیا۔ اس وقت یہ علاقے ترکی قلمرو

میں شامل تھے۔ ان حملوں سے سارے عالم اسلام میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ جو اگلے دو برسوں تک چھائی رہی۔ اس دوران میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے دار العلوم دیوبند میں چھٹی کرائی۔ طلباء کے وفود چندے کے لئے بھیجے۔ دلی میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خاں سرگرم تھے۔ ہلال احمر کا ایک میڈیکل وفد ترکوں کی مدد کے لئے بھیجا گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں میں زبردست اضطراب پایا جاتا تھا۔ جو بعد میں تحریک خلافت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی جس میں شروع میں ترکی کی سلطنت عثمانیہ شامل نہ تھی۔ ۱۹۱۴ء میں حضرت شیخ الہند کی ہدایت پر یاغستان کے علاقہ میں حاجی ترنگ زئی اور مولانا سیف الرحمٰن کابلی کی قیادت میں انگریز کے خلاف جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ ابتدا میں مجاہدین نے برطانوی فوج کی پلٹنیں کی پلٹنیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیں اور دشمن کو زبردست نقصان پہونچایا۔ لیکن بعد میں اسلحہ اور رسد کی کمی کے باعث اس سلسلہ کو بند کرنا پڑا۔ حضرت شیخ الہند کو یہ اطلاع پہونچائی کہ بغیر کسی حکومت کی پشت پناہی کے، سلسلہ جہاد جاری رکھنا دشوار ہے — یاغستان کی یہ جنگ وقتی طور پر برطانیہ کے لئے پریشان کن تھی۔ اس لئے کہ ایسے وقت میں جب کہ جنگ عظیم جاری تھی۔ اپنی فوج کی خاصی تعداد اس علاقہ میں رکھنی پڑی۔ یاغستان سے اصرار تھا کہ حضرت شیخ الہند خود تشریف لاکر کمان سنبھال لیں۔ لیکن راستے مخدوش تھے اور حضرت شیخ الہند پرسی آئی ڈی کی کڑی نگاہ تھی۔ اس لئے آپ نے سفر حجاز کا پروگرام بنایا۔ تاکہ براستہ حجاز آپ ترکی کی سلطنت سے گذر کر کابل پہنچ سکیں۔ آپ نے مولانا ابو الکلام آزاد سے مشورہ کیا۔ انھوں نے ہندوستان ہی میں رہ کر گرفتار ہونے کی صلاح دی۔ آپ نے سفر حجاز کو ترجیح

دی۔ اس دوران میں حکومت کے ہاتھ "ریشمی خطوط" لگ چکے تھے۔ اندر ہی اندر ان کی جانچ ہو رہی تھی۔

ریشمی خطوط:۔ ۱۴ اگست ۱۹۱۶ء کو ملتان کے خان بہادر رب نواز خاں نے ملتان ڈویژن کے کمشنر کو زرد ریشمی کپڑے کے تین ٹکڑے دکھائے جن پر خوشخط تحریر تھی۔ خان بہادر کو یہ خطوط عبدالحق سے ملے تھے جو اس کے بچوں کا اتالیق تھا اور ۱۹۱۵ء میں ان کے ہمراہ کابل گیا تھا۔ عبدالحق کو جو رب نواز خاں کے پاس آیا تھا اور باتوں باتوں میں ان خطوط کا ذکر آیا تھا۔ یہ خطوط شیخ عبدالرحیم کو دینے تھے۔ وہ یہ خطوط مدینہ منورہ میں پہونچانے والے تھے۔ کمشنر ملتان نے یہ خطوط پنجاب کے گورنر سر مائیکل ایڈوائر کے پاس بھیجے۔ اور وہاں سے برطانوی وائسرائے کے پاس فائل پہونچی، یہ ریشمی خطوط تعداد میں تین تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے پہلے خط میں شیخ عبدالرحیم سندھی کے نام کچھ ہدایات لکھی تھیں۔ دوسرا خط حضرت شیخ الہند کے نام تھا۔ تیسرے خط میں بھی دوسرے خط کا باقی ماندہ مضمون تھا۔ ان خطوط میں مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی کارگزاریوں کی رپورٹ دی ہے۔ اور دیگر حقائق تحریر کئے ہیں۔ ان خطوط کی چھان بین کے بعد حضرت شیخ الہند کی انقلابی تحریک کا گویا پورا نقشہ حکومت کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ ہندوستان میں وسیع پیمانہ پر گرفتاریاں ہوئی تھیں۔

شیخ الہندؒ کا سفر حجاز:۔ جس زمانہ میں جنگ عظیم نقطۂ عروج پر تھی شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے سفر حجاز کا پروگرام بنایا۔ آپ ۱۰ ستمبر ۱۹۱۵ء کو دیوبند سے اور ۱۸ ستمبر کو بمبئی سے جدہ کے لئے روانہ ہوئے۔ آپ کے ہمراہ مولانا محمد میاں انبیٹھوی (مولانا منصور انصاری) مولانا عزیز گل، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری، حاجی خان محمد صاحب، مولانا مطلوب الرحمٰن

دیوبندی، مولانا وحید احمد مدنی اور دیگر رفقا تھے۔

اس دوران میں انگریز حکومت آپ کا وارنٹ نکال چکی تھی۔ بمبئی میں حکومت یوپی کا تار پہونچا لیکن جہاز بمبئی سے روانہ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد عدن کے انگریز گورنر کو تار بھیجا گیا۔ وہاں سے بھی جہاز گذر چکا تھا۔ آپ پہلے جدہ اور بعد ازاں ۹ ر اکتوبر آپ مکہ معظمہ بحفاظت تمام پہونچ گئے۔ وہاں اس وقت ترکی حکومت تھی۔ اگلا برس حجاز میں آپ کی سرگرمیوں کا تھا، مکہ معظمہ میں آپ نے حجاز کے ترکی گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی اس نے تین فرامین لکھ کر دیئے۔ ایک میں مسلمانان ہند کے نام پیغام تھا جس میں حضرت شیخ الہند پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اپیل کی گئی تھی کہ ان کی حمایت و امداد کریں۔ ترکی حکومت کی طرف سے بھی امداد کا یقین دلایا گیا تھا۔ یہ تحریر غالب نامہ کی حیثیت سے مشہور ہوئی اور اس کی کاپیاں یاغستان میں تقسیم کی گئیں۔ ایک تحریر مدینہ طیبہ کے گورنر بصری پاشا کے نام تھی۔ اس میں اظہار اعتماد کرتے ہوئے فرمائش کی گئی تھی کہ انھیں استنبول انور پاشا کے پاس پہونچا دیں، لیکن اس کی نوبت نہ آئی اس زمانہ میں خود ہی انور پاشا اور جمال پاشا نے مدینہ منورہ میں حاضری دی انھوں نے بھی فرامین اور پیغامات لکھ کر دیئے۔ جن کا مضمون غالب نامہ سے ملتا جلتا تھا۔ ترکی رعایا کو مولانا محمود حسن کی مدد کی ہدایت دی گئی تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے جن کے ہمراہ خاص شاگرد مولانا حسین احمد مدنیؒ تھے براہ ایران یاغستان پہونچانے کی خواہش ظاہر کی، جمال پاشا نے جواب دیا اس وقت ایسا ممکن نہیں۔ روس نے ایران کے راستہ کو اور انگریزوں نے عراق کے راستہ کو کاٹ دیا ہے، آپ حجاز ہی میں اپنا مرکز قائم کریں۔ آپ اپریل سنہ ۱۹۱۶ء میں مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ تشریف لائے، فرامین اور پیغامات ہندوستان پہونچانے

۴ مئی سنہ ۱۹۱۶ء کو آپ طائف تشریف لے گئے تاکہ استنبول جانے کے لئے پروانۂ اجازت حاصل کریں۔ متعدد وجوہ سے دیر ہوتی رہی۔ اسی دوران میں مکّہ کے والی شریف حسین نے ترکی حکومت کے خلاف بغاوت کردی انگریزوں کی ساز باز سے کی گئی یہ بغاوت کامیاب رہی۔ اب انگریزوں کو موقع ملا کہ وہ حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقا پر ہاتھ ڈال سکے۔

گرفتاری:۔ شریف حسین کی بغاوت کے خلاف جو بے چینی ہندوستانیوں میں پائی جاتی تھی اسے دور کرنے کے لئے حکومت ہند نے خان بہادر مبارک علی اورنگ آبادی کو حجاز بھیجا تاکہ ایک فتویٰ منگوایا جائے۔ چنانچہ خان بہادر مذکور نے شریف کے عہدہ دار علما کی امداد سے ایک استفتا مرتب کرایا، جس میں ترکی قوم کی مطلقاً تکفیر تھی، سلاطین آل عثمان کی خلافت سے انکار کیا گیا تھا۔ اور شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب قرار دیا گیا تھا۔ بہت سے شریفی علمار نے اس پر دستخط کر دیئے تھے لیکن علمار کی کثیر تعداد خوف زدہ تھی۔ حضرت شیخ کے سامنے یہ فتویٰ پیش کیا گیا تو حضرت موصوف نے سختی سے انکار فرمادیا۔ اس پر شریف حسین کے دل میں شیخ الہند کی طرف سے غبار پیدا ہو گیا۔ اب گرفتاری یقینی ہو چکی تھی۔ چنانچہ انگریزوں نے حضرت شیخ الہند کو طلب کیا۔ شریف حسین نے فوراً گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے۔ پہلے مولانا حسین احمد مدنیؒ کو گرفتار کیا گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا وحید احمد مدنیؒ کو چھپا دیا گیا تھا۔ بعد میں مولانا عزیر گل اور حکیم سید نصرت حسین کو گرفتار کیا گیا۔ ان لوگوں نے حضرت شیخ الہند کے متعلق لاعلمی ظاہر کی۔ پولیس انھیں ڈھونڈتی رہی۔ جب پتہ نہ لگ سکا تو شریف حسین نے حکم دیا اگر عشا تک مولانا محمود حسن حاضر نہ ہوں تو ان کے دونوں رفیقوں مولانا عزیر گل اور حکیم نصرت حسین کو گولی سے اڑادو۔ حضرت شیخ الہند کو اطلاع ہوئی تو فرمایا مجھے گوارا نہیں کہ میرے

باعث میرے کسی دوست کا بال بیکا ہو۔ چنانچہ عشاء کے قریب حضرت خود گرفتاری کے لئے تشریف لے آئے۔ دلّی کے کچھ تاجر حضرات شریف حسین کے پاس سفارش کے لئے پہونچے تو اس نے جواب دیا۔

"ہماری انگریزوں سے دوستی نئی ہے۔ ہمیں یہ دوستی قائم رکھنی ضروری ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس میں رخنہ پیدا ہو۔"

یہ گرفتاری دسمبر ۱۹۱۶ء میں عمل میں آئی۔ ان سب کو جدہ بھیج دیا گیا۔ برطانوی ایجنٹ کرنل ولسن کہیں باہر چلا گیا تھا۔ واپس آنے پر ان حضرات کو مصر روانہ کرنے کا حکم دیا۔ ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو حذیو نامی جہاز پر سوار کرا کے انھیں مسلّح پہرہ میں ۱۶ ار جنوری کو سویز پہونچایا گیا۔ وہاں سے قاہرہ اور بعد ازاں جیزہ کی "سیاسی" جیل بھیج دیا گیا۔ یہاں تفتیش ہوئی۔ اور ان کے بیانات لئے گئے۔ حضرت شیخ الہند کو ایک الگ کمرہ میں کرسی پر بٹھایا گیا۔ اس میں تین انگریز موجود تھے۔ جن میں سے دو انگریز نہایت صاف اردو بولتے تھے۔ ذیل میں کچھ سوال جواب دیئے جاتے ہیں۔

سوال: آپ کو شریف نے کیوں گرفتار کیا؟

جواب: اس کے محضر پر دستخط نہ کرنے کی بنا پر۔

سوال: آپ نے اس پر دستخط کیوں نہ کئے؟

جواب: خلاف شریعت تھا۔

سوال: آپ مولوی عبید اللہ کو جانتے ہیں؟

جواب: ہاں۔

سوال: کہاں ہے؟

جواب: انھوں نے دیوبند میں عرصہ دراز تک مجھ سے پڑھا ہے۔

سوال: وہ اب کہاں ہیں؟

جواب: میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں عرصہ ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوا ہے کہ حجاز وغیرہ میں مقیم ہوں۔

سوال: ریشمی خطوط کی کیا حقیقت ہے؟

جواب: مجھے کچھ علم نہیں۔ نہ میں نے دیکھا ہے۔

سوال: وہ لکھتا ہے کہ آپ اس کی سیاسی سازش میں خلافِ برطانیہ شریک ہیں۔ اور آپ فوجی کمانڈر ہیں؟

جواب: وہ لکھتا ہے تو اپنے لکھنے کا خود ذمہ دار ہوگا۔ بھلا میں اور فوجی کمانڈری، میری جسمی حالت ملاحظہ فرمایئے اور پھر عمر کا اندازہ لگایئے۔ میں نے تمام عمر مدرسی میں گذاری مجھ کو فنون حربیہ اور فوج کی کمان سے کیا نسبت۔

سوال: مولوی عبید اللہ صاحب نے دیوبند میں جمعیۃ الانصار کیوں قائم کی تھی۔؟

جواب: مدرسہ کے مفاد کے لئے۔

سوال: پھر کیوں علحٰدہ کیا گیا؟

جواب: آپس کے اختلافات کی وجہ سے۔

سوال: غالب نامہ کی کیا حقیقت ہے؟

جواب: غالب نامہ کیسا؟

سوال: غالب پاشا گورنر حجاز کا خط جس کو محمد میاں لے کر حجاز سے گیا ہے اور آپ نے غالب پاشا سے اس کو حاصل کیا ہے۔

جواب: مولوی محمد میاں کو میں جانتا ہوں۔ وہ میرا رفیق سفر تھا۔ مدینہ منورہ سے وہ مجھ سے جدا ہوا ہے، وہاں سے لوٹنے کے بعد اس کو جدّہ اور مدینہ منورہ میں تقریباً ایک ماہ ٹھہرنا پڑا تھا۔ غالب پاشا کا خط کہاں ہے جس کو آپ میری طرف

منسوب کرتے ہیں ۔؟

سوال کنندہ: وہ بھاگ کر حدود افغانستان میں چلا گیا۔

مولانا: پھر آپ کو خط کا پتہ کیوں کر چلا۔؟

سوال کنندہ: لوگوں نے دیکھا۔

مولانا: آپ ہی فرمائیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز اور میں ایک معمولی آدمی۔ میرا وہاں تک کہاں گذر ہو سکتا ہے۔ پھر میں ناواقف شخص۔ نہ زبان ترکی جانوں نہ پہلے سے ترکی حکام سے کوئی ربط ضبط۔ حج سے چند دن پہلے مکہ معظمہ پہونچا۔ اپنے امور دینیہ میں مشغول ہو گیا۔ غالب اگرچہ حجاز کا گورنر تھا۔ مگر طائف میں رہتا تھا۔ میری وہاں تک رسائی نہ حج کے پہلے ہو سکتی تھی نہ بعد از حج۔ یہ بالکل غیر معقول بات ہے۔ کسی نے یوں ہی اڑا دی۔

سوال: کاغذات میں لکھا ہے کہ آپ سلطان ٹرکی، ایران اور افغانستان میں اتحاد کرانا چاہتے ہیں اور پھر ایک اجتماعی حملہ ہندوستان پر کر کے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرانا چاہتے ہیں اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے ہیں۔

جواب: میں تعجب کرتا ہوں کہ آپ کو بھی حکومت کرتے اتنے دن گذر چکے کیا آپ گمان کر سکتے ہیں کہ میرے جیسے گمنام شخص کی آواز بادشاہوں تک پہونچ سکتی ہے۔ اور کیا سالہا سال کی ان کی عداوتیں میرے جیسا شخص زائل کر سکتا ہے اور پھر اگر زائل بھی ہو جائیں تو کیا ان میں ایسی طاقت ہے کہ وہ اپنے ملک کی ضرورتوں سے زائد سمجھ کر ہندوستان کی حدود پر فوجیں پہونچا دیں اور اگر پہونچا بھی دیں تو آیا ان میں آپ سے جنگ کی طاقت ہو گی (جواب خاص توجہ چاہتا ہے۔)

سوال کنندہ: فرماتے تو آپ سچ ہیں۔ مگر ان کاغذات میں ایسا ہی لکھا ہے

سوال: شریف کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: وہ باغی ہے۔

سوال وجواب کا یہ نمونہ حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی بصیرت اور تدبر ظاہر کرنے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ دیگر قیدیوں کے بھی بیانات ہوئے، یہاں ہر ایک کو الگ کال کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ پھانسی کا حکم ہوگا۔ مگر ثبوت فراہم نہ ہو سکا۔ چنانچہ صرف قید میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ہندوستان کے مجاہدین آزادی کے اس قافلہ کو ۱۵ فروری ۱۹۱۷ء کو بذریعہ جہاز مالٹا روانہ کر دیا گیا۔

تحریک کی ناکامی: حضرت شیخ الہند کا انقلاب کا منصوبہ اپنی جگہ مکمل تھا۔ ترکی اور افغانستان کی مدد سے سرحد پر حملہ۔ آزاد سرحدی علاقہ سے خاص جنگی کارروائی اور اندرون ملک مراکز کی شورش اس منصوبہ کے خاص اجزا تھے۔ لیکن کئی وجوہ سے یہ تحریک ناکام ہوئی، پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ ترکی کو اس میں زبردستی گھسیٹ لیا گیا۔ عرب ممالک پر سے ترکی کا اقتدار عملاً ختم ہو گیا۔ عین اس وقت جب کہ برطانیہ جنگ ہار رہا تھا اور جرمنی اور اس کے حلیف (ترکی سمیت) جیت رہے تھے، امریکہ جنگ میں کود پڑا۔ اس طرح برطانیہ اور اس کے اتحادی ہاری ہوئی جنگ جیت گئے۔ ادھر سرحدی قبائل میں انگریزوں نے بے حساب روپیہ خرچ کر کے جہاد کی تحریک پر اثر ڈالا۔

حضرت شیخ الہند نے سفر حج پر روانگی سے پہلے حملہ کی تاریخ کا تعین بھی کر دیا تھا ہر برانچ کو اس کی اطلاع بھی دیدی گئی تھی۔ لیکن حکم ثانی کا انتظار لازمی قرار دیا تھا۔ انور پاشا سے جو معاہدہ طے پایا تھا اس میں انقلاب کے لئے ۱۹ فروری

۱۹۱۷ء کی تاریخ کی منظوری تھی لیکن سیاسی تبدیلیوں نے اس خواب کو شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا جہاں تک اثرات کا تعلق ہے۔ تحریک بہت کامیاب ہے۔ اس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ تحریک خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں اسی انقلابی تحریک کا نتیجہ تھیں جس نے حکومت وقت کو ہلا دیا تھا۔

وابستگان اور تحریک کے ارکان: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے شاگردوں، اور مریدوں کی تعداد ہزاروں تک پہونچتی ہے، ان میں خاصی تعداد آپ کی انقلابی تحریک میں شامل تھی، اسی طرح معاصر انقلابی رہنماؤں اور بزرگوں کی بڑی تعداد تحریک سے وابستہ تھی۔ پہلے ان ہی معاصر رہنماؤں کی فہرست دی جاتی ہے۔

۱۔ مولانا ابو الکلام آزاد۔ ۲۔ حکیم محمد اجمل خاں۔ ۳۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۴۔ حکیم عبد الرزاق انصاری۔ ۵۔ سرحدی گاندھی خان عبد الغفار خاں۔ ۶۔ حاجی فضل واحد ترنگ زئی۔ ۷۔ مولانا محمد علی۔ ۸۔ حسرت موہانی۔ ۹۔ مولانا عبد الرحیم رائے پوری۔ ۱۰۔ راجہ مہندر پرتاپ۔ ۱۱۔ ڈاکٹر متھرا سنگھ۔ ۱۲۔ تیجا سنگھ۔ ۱۳۔ ایم۔ این رائے۔ ۱۴۔ ویریندر ناتھ چٹوپادھیائے۔ ۱۵۔ لالہ ہردیال ایم۔ اے (غدر پارٹی)۔ ۱۶۔ راس بہاری بوس۔ ۱۷۔ اے پی بی اچاریہ۔

ذیل میں آپ کے خاص خاص شاگردوں کی فہرست دی جاتی ہے۔ نمبر دس تک آپ کے ممتاز شاگردوں کے نام ہیں، اس کے بعد ان کے نام ہیں جو شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کی انقلابی تحریک سے کسی نہ کسی طریقہ سے وابستہ تھے۔ ان میں سے بعض کا کام پیغام رسانی تھا۔ بعض چندے کرتے تھے اور کچھ مالی امداد مراکز تک پہونچاتے تھے۔ اور کچھ عملی طور پر سرگرم حصہ لیتے تھے۔

۱۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۲۔ امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ
۳۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
۴۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند
۵۔ مولانا سید احمد مدنیؒ بانی مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ
۶۔ مولانا سید فخرالدینؒ سابق صدر جمعیۃ علماء ہند
۷۔ مولانا محمد صدیق مہاجر مدنیؒ
۸۔ مولانا محمد ابراہیمؒ بلیاوی
۹۔ مولانا اعزاز علی صاحبؒ
۱۰۔ مولانا محمد الیاس صاحبؒ بانی تبلیغی جماعت
۱۱۔ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ
۱۲۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ
۱۳۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ
۱۴۔ مولانا محمد میاںؒ (مولانا منصور انصاری کے نام سے مشہور ہیں)
۱۵۔ مولانا محمد اکبر صاحبؒ پشاوری
۱۶۔ مولانا عبدالسمیع صاحب
۱۷۔ مولانا مفتی نصیر اللہ صاحب
۱۸۔ مولانا محمد صادق صاحب۔ کراچی
۱۹۔ مولانا عزیر گل سرحدی
۲۰۔ مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی
۲۱۔ مولانا عبدالرحیم

۲۲۔ مولانا سید حامد حسن گنگوہی

۲۳۔ مولانا رحمت اللہ نہٹور (ضلع بجنور)

۲۴۔ مولانا احمد اللہ پانی پتی

۲۵۔ مولانا فضل ربی

آزادی کی قیمت

ایک الجزائری راہنما سے ایک اخبار نویس نے دریافت کیا آپ لوگوں نے آزادی کس طرح حاصل کی ؟

الجزائری رہنما نے ایک لمحہ کے لئے اس کی طرف دیکھا ، کرسی سے اٹھا اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر کہا اس طرح آزادی حاصل کی ہے۔

اخبار نویس نے کھڑکی سے دیکھا۔

حد نظر تک قبریں ہی قبریں تھیں ۔!

مالٹا میں نظر بندی

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عزیر گل صاحبؒ مولانا حکیم سید نصرت حسینؒ اور مولانا وحید احمد مدنیؒ کے متعلق برطانوی حکام نظر بندی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ۱۵ فروری ۱۹۱۷ء کو حکم ملا کہ کل مالٹا کے لئے روانگی عمل میں آئے گی۔ چنانچہ ۱۶ فروری کو جہاز میں ہندوستانی مجاہدین آزادی کے اس قافلہ کو اسکندریہ سے مالٹا کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ اس جہاز کے آگے ایک جنگی جہاز کروز حفاظت کے لیے چل رہا تھا۔ چونکہ جنگ عظیم جاری تھی۔ فریق ایک دوسرے کے جہازوں کو نشانہ بناتے تھے۔ ۲۱ فروری ۱۹۱۷ء کو یہ جہاز مالٹا میں لنگر انداز ہوا۔ مالٹا کے ایک قدیم قلعہ کو جیل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ یہ قلعہ زمانہ قدیم میں پہاڑ کھود کر ایک جنگجو قلعہ کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا اس کی فصیل بڑی مستحکم تھی۔ قلعہ کے اندر ایک وسیع میدان کے علاوہ کافی تعداد میں عمارتیں بنی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ قلعہ جنگی ضرورتوں کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس قلعہ کو چند حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ ان کے نام اس طرح تھے۔ سینٹ کلیمنٹ یا جرمن کیمپ۔ بلغار کیمپ، روم کیمپ، سینٹ کلیمنٹ براکس یا عرب کیمپ، وردالہ کیمپ، وال فرسٹ نیو وردالہ، روگیٹ کیمپ، سینٹ کلیمنٹ براکس یا عرب کیمپ۔ آخر الذکر کیمپ سویلین مسلم قیدیوں اور معمولی فوجی لوگوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس کے قریب سیر کے لئے ایک پہاڑ تھا جو کہ پر فضا مقام تھا۔ اس کی عمارتیں بھی اچھی تھیں۔ ان کیمپوں میں دکانیں اور شفاخانے

بھی تھے۔ ہر کیمپ پر ایک افسر اعلیٰ مقرر تھا۔ رسد کی تقسیم کا انتظام اس کے سپرد ہوتا تھا۔ اشیائے خوردونوش یہاں سے لے کر قیدی اپنا کھانا پکاتے یا پکواتے تھے۔ ان کے ٹھہرنے کا انتظام پہلے روگیٹ کیمپ میں کیا گیا۔ اس کیمپ میں دو ہندوستانی قیدی پہلے سے تھے۔ ایک ڈاکٹر غلام محمد پنجابی۔ وہ مصر میں قیام پذیر تھے۔ اس زمانہ میں وہاں ایک خاص واقعہ ہوا جس سے ان کا بھی تعلق تھا۔ گرفتار کر کے یہاں بھیج دیئے گئے۔ دوسرے ایک بنگالی مسٹر سیدار تھے۔ یہ چندر نگر بنگال کے رہنے والے تھے۔ وہ برہمن تھے۔ فرانسیسی، انگریزی اور جرمنی زبانیں جانتے تھے۔ سنسکرت سے بھی خوب واقف تھے۔ لیکن اردو سے ناواقف۔ وہ بم بازی کے ایک کیس میں ماخوذ تھے۔ ان کو گرفتار کر کے یہاں مالٹا بھیج دیا گیا تھا۔ ایک ماہ تک مجاہدین آزادی کی ہماری اس ہندوستانی جماعت کو روگیٹ کیمپ میں رکھا گیا۔ بعدازاں انھیں سینٹ کلیمنٹ براکس میں منتقل کر دیا گیا جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ قیدی سامان رسد لے کر اپنا کھانا خود پکاتے تھے یا اجرت پر دوسرے غریب قیدیوں سے پکواتے تھے کھانے کی اشیا میں حلال گوشت کا انتظام نہیں تھا۔ اس لئے کبھی کبھی قیدیوں کی یہ جماعت باہر سے مرغی یا خرگوش وغیرہ خرید کر حلال کرتے تھے اور گوشت پکاتے تھے کھانے کی تیاری کی ذمہ داری شاگرد رشید شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رح نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ اور شدید اصرار کے باوجود اس میں دوسروں کو ہاتھ بٹانے نہیں دیا۔

قید کی زندگی ایک آزمائش ہوتی ہے یہاں انسان کی شخصیت کے تمام پہلو ابھر کر سامنے آجاتے ہیں، جس شخصیت میں جس درجہ جوہر شرافت اور اعلیٰ اوصاف ہوں گے وہ نکھر کر سامنے آجائیں گے۔ خدا کے ان بندوں کے مقدر میں سنتِ یوسفی کی پیروی بھی لکھی تھی۔ جیل میں حضرت شیخ الہند اور ان کی جماعت ہمہ وقت

ذکر وفکر، یادِ خداوندی اور علمی مشاغل میں مصروف رہتی تھی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند نے جیل میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ اس سے ان کی ذہانت اور علوم اسلامی میں اعلیٰ استعداد و قابلیت کا پتہ بھی چلتا ہے کہ حوالہ کی ضروری کتابوں کے بغیر قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ اور ایسا ترجمہ جس پر اس دور کے بڑے بڑے علمار نے مہر تصدیق ثبت کی، اور اسے اپنے دور کا بہترین ترجمہ قرار دیا۔

مالٹا کی جیل میں مجاہدین حریّت کی اس جماعت کے شب و روز کس طرح بسر ہوئے تھے۔ اور ان کے مشاغل اور احساسات و خیالات کیا تھے۔ ان کا اندازہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی کتاب سفرنامہ شیخ الہند یا اسیر مالٹا کے اقتباسات سے ہوگا، ان کو میں نے اس ڈھنگ سے ترتیب دینے کی کوشش کی ہے کہ کامیابی کے ساتھ تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔

قیدیوں کے لئے سامان: خشک سیاہ چائے، ڈبہ کا دودھ، شکر، سفید مرگرین، پنیر، چاول، دال مسور، جیلی، نمک موم بتی، یہ چیزیں ایک خاص وزن اور مقدار سے ہفتہ وار ملتی تھیں اور روٹی گوشت ترکاری، کوئلہ روزانہ ملتا تھا۔ صابن، کپڑے دھونے کا ایک ہفتہ میں ایک بار ملتا تھا۔ گوشت وہ ملتا تھا جو کہ وہاں مدتوں سے برف میں محفوظ چلا آتا تھا چونکہ مالٹا جنگی حرکات کے لئے ایک مرکز ہے اس لئے وہاں تمام فوجی ضروریات بہت بڑے پیمانہ پر ہمیشہ موجود رہتی ہیں وہاں پر گوشت کے لئے سنگ مرمر کا ایک بڑا مکان ہندسی طریقہ پر بنا ہوا ہے جس میں برف کی سلوں میں گوشت ہزاروں من ہمیشہ دبا رہتا ہے۔ یہ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ سے لائے جاتے اور ذخیرہ کئے جاتے ہیں اور بوقت ضرورت صرف ہوتے ہیں ہر ٹکڑے پر ڈاکٹری سارٹیفکٹ لگا ہوتا ہے جس سے جملہ کیفیات گوشت

کی معلوم ہوتی ہیں۔ بعض بعض ٹکڑے ۱۶ء سولہ، ۱۶ء سولہ اور ۱۷ء سترہ، ۱۷ء سترہ برس کے نکلے مگر ظاہری صورت میں کوئی فرق تازہ گوشت سے نہیں ہوتا تھا۔ البتہ کھانے والوں سے سنا گیا ہے کہ تازہ گوشت کی سی لذت نہیں ہوتی تھی"

قیدیوں کی گنتی: "روزانہ ہر کیمپ میں صبح و شام گنتی ہوتی تھی صبح کو تقریباً ۹½ بجے اور شام کو چار بجے جتنے سویلین اور فوجی سپاہی تھے سب کو قطار باندھ کر کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ سارجنٹ یا کیپلر آکر گنتا تھا اور پھر چلا جاتا تھا۔ افسر اور نہایت معزز سویلین آدمیوں کی گنتی ان کی جائے قیام پر ہوتی تھی۔ ان کو ضروری ہوتا تھا کہ وہ اپنے اپنے مقام پر گنتی کی سیٹی کے بعد موجود ہو جائیں۔ اور جب تک اس سے فراغت نہ ہو۔ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بھی گنتی ان کی قیام گاہ میں ہوتی تھی"

"مجموعہ اسرار (قیدیوں) کا تقریباً تین ہزار تھا جن میں اکثر جرمنی تھے یعنی تقریباً نصف حصہ جرمن تھے جو کہ عموماً سویلین تھے اور مصر و سوڈان وغیرہ سے پکڑ لئے گئے تھے۔ اور باقی فوجی تھے جو مختلف افریقہ کے میدان وغیرہ سے ہاتھ آئے تھے۔ انھیں میں ایمڈن جہاز کے لوگ بھی تھے اور باقی ماندہ آسٹرین، بلغاری، ترکی، مصری شامی وغیرہ تھے۔ عموماً جو لوگ مشرقی محاذ سے پکڑے جاتے تھے وہ برما اور ہندوستان کے مختلف مقامات میں بھیجے جاتے تھے مگر ان لوگوں میں جن کو زیادہ خطرناک شمار کیا جاتا تھا۔ ان کو مالٹا میں بھیجا گیا تھا چناق قلعہ (درہ دانیال) سے بھی لوگ یہاں پر لائے گئے تھے۔ ان کو جب داخل کیا جاتا تھا۔ ان کو نمبر بتلا دیا جاتا تھا اور ایک کاغذ ان کے نمبر کا دیدیا جاتا تھا تاکہ بوقت ضرورت تمیز ہو سکے چنانچہ ہمارے ساتھ بھی یہی کیا گیا اور ہمارے نمبر حسب ذیل تھے۔ مولوی عزیز گل صاحب ۲۲۱۵ء، حکیم نصرت حسین صاحب ۲۲۱۶ء، حسین احمد

ع ۲۲۱۷، وحید احمد ع ۲۲۱۸، حضرت مولانا مرحوم ع ۲۲۱۹

ہلال احمر اور صلیب احمر: "جو اسرار (قیدی) عیسائی مذہب کے تھے۔ ان کی ضروریات کے لئے صلیب احمر سے خاص خبر گیر ہوتی تھی ــــــ استنبول سے بھی اسرار (قیدیوں) کے لئے ہلال احمر نے بارہا اشرفیاں اور کتابیں وغیرہ بھیجیں۔ جن کے ذریعہ سے عام طور پر مسلمانوں کی خوراک، تعلیم اور دیگر ضروریات وغیرہ کی خبر گیری کی گئی اور اخیر تک جاری رہی اور بوقت واپسی اوطان ان کو تھوڑی مقدار نقد کی بھی دی گئی۔ اس تقسیم میں ترکی افسر کسی ملک کی خصوصیت نہ کرتے تھے۔ ہم کو بھی دینا چاہا مگر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور ہم سبھوں نے کہا کہ ہم اگر اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ ایسے وقت میں دولت علیہ اور خلافت سنّیہ کو مدد دے سکیں تو کیا ہم کو کسی طرح مناسب ہے کہ ہم اس نقد کو لیں۔ اور پھر بفضلہ تعالیٰ ہمارے پاس ضرورت کے موافق گورنمنٹ سے نقدی بھی ملتا ہے اور کچھ ہمارے پاس بھی ہے۔"

قیدیوں کے علمی اشغال: کتابیں ہر زبان کی یا تو وہیں مل جاتی تھیں، یا طلب پر مصر یا انگلینڈ، جرمن، اطالیہ، مراکش وغیرہ سے آسکتی تھیں۔ اس لئے یہ اسارت گاہ (قید خانہ) ایک اچھا خاصا دارالعلوم (یونیورسٹی) بن گیا تھا۔ خصوصاً زبانوں کے لئے۔ ہم نے بہت کم ایسے آدمی دیکھے جنھوں نے علمی مذاق رکھتے ہوئے کم از کم ایک دو زبان نہ سیکھ لی ہو۔

اسرار (قیدیوں) کے لئے اخباروں میں سے صرف ٹائمز لندن اور ملتان، پیرس اور اطالیہ کے ایک ایک اخبار کی اجازت تھی۔ اور مصر کے اخباروں میں سے الاہرام اور المقطم کی اجازت تھی۔ دوسرے نہیں آسکتے تھے۔

مولانا کا استقلال: مولانا مرحوم کو ہندوستان کی سردی بھی سخت اذیت

دیتی تھی۔ وہ سردی کے ایام میں دن کو ہمیشہ دھوپ میں سوتے تھے بلکہ بسا اوقات
گرمیوں کے زمانہ میں بھی۔ سردیوں میں آگ اور کوئلے سے تاپنے کی اکثر عادت تھی۔
روئی کے کپڑے بہت استعمال فرمایا کرتے تھے۔ گھٹنوں میں اکثر درد رہا کرتا تھا۔
سردی کے ایام میں ہاتھوں اور پیروں پر ورم آجاتا تھا جو سینکنے سے جاتا تھا۔ مگر
مالٹا کی اس سخت سردی میں حسب عادت شب کو ۱½ یا دو بجے کا اٹھنا کبھی انھوں
نے نہ چھوڑا۔ اسی وقت پیشاب فرماتے۔ وضو کرتے تہجد کی نماز ادا فرماتے اور اس
کے بعد صبح تک مراقبہ اور ذکر خفی میں وقت گذارتے۔ ہم جوانوں کو تو منھ کھولنا بھی
قیامت معلوم ہوتا تھا۔ اٹھنا یا نماز پڑھنا یا وضو کرنا تو ہزار قیامت سے بھی زیادہ
تھا۔ مگر ان کی استقامت ان کو اپنے اوقات کی پابندی اور اپنے پروردگار کی
عبادت پر مجبور کرتی تھی۔ یہی حالت ہمیشہ سفر اور حضر میں مولانا کی رہی پھر اس
پر طرہ یہ تھا کہ اس طرح اٹھتے تھے اور اس طرح آہستہ قدم رکھتے اور دروازہ وغیرہ
کھولتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔ نہ نیند میں اصلاً فرق آتا تھا۔ باوجودیکہ ہم سب
خدام ہی تھے اور سفر و حضر میں ہمراہ اور رفیق تھے۔ مگر ہم سبھوں سے بھی چھپانے کی
آخر تک برابر کوشش کرتے رہے۔ چونکہ پیشاب کا عارضہ تھا اس لئے عموماً شب
میں چند مرتبہ وضو کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ پانی بھی نہایت سرد ملتا تھا۔ مگر خدا
کے فضل و کرم سے باوجود ان سب امور مخالف طبع کے کوئی تکلیف مولانا کو روگیٹ
کیمپ کے ایک ماہ کے قیام میں مرض وغیرہ کی نہیں ہوئی۔

قیدیوں کی باہمی ہمدردی: سب کے سب اتحادیوں اور خصوصاً برٹش گورنمنٹ، اور انگلش قوم کے دشمن
تھے۔ علانیہ انگریزوں کو برا کہتے تھے۔ اگر انگریزوں کی شکست اور ان پر یا ان
کے حلفاء پر کسی مصیبت کی خبر آتی تھی تو خوشیاں مناتے تھے۔ جھنڈے اڑاتے تھے

شور وشغب مچاتے تھے۔ اور اگر خدانخواستہ جرمن، ٹرکی، آسٹریا یا بلغار کسی کی کوئی بری خبر آجاتی تو سب کے سب غمگین نظر آتے تھے۔ اگرچہ اس تین ہزار کی جماعت میں کوئی مسلمان تھا، کوئی عیسائی، کوئی یہودی تھا، کوئی کیتھولک، کوئی کالا تھا، کوئی گورا، کوئی مشرقی تھا، کوئی مغربی، کوئی سویلین تھا، کوئی فوجی، کوئی ایشیائی تھا، کوئی افریقی، کوئی یوروپین تھا، کوئی ترکی۔ مگر مصیبت نے سب میں ایسا رشتہ اتحاد جوڑ دیا تھا کہ ہر ایک دوسرے پر جاں نثار اور فدا نظر آتا تھا۔ سب کے سب انگریز افسروں اور فوجیوں کو غصہ اور غضب کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہر اسیر کو نہایت عظمت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے حسب مراتب معاملہ کرتے تھے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے عموماً ہر قوم کے ذی علم اور مقتدر لوگوں کو بہت زیادہ ہمدردی تھی اور بہت زیادہ تعظیم سے پیش آتے تھے۔ عید کے ایام میں مسلمانوں کے علاوہ جرمن آسٹرین وغیرہ کے مقتدر اور ذی وجاہت لوگ ملنے اور مبارکباد دینے کے لئے آتے اور گلدستہ وغیرہ پیش کرتے تھے۔ پرنس جرمنی جو کہ غالباً قیصر جرمنی کا بھتیجا تھا اور ایمڈن جہاز میں بحری فوجی کپتان کے عہدہ پر تھا۔ اور جملہ جرمنی اسراء (قیدیوں) میں باعتبار مرتبہ کے بھی یعنی شاہی خاندان کے ہونے کے بہت بڑی عظمت رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ عید میں مولانا مرحوم کے پاس آتا تھا۔ چند منٹ بیٹھتا اور چائے نوش کر کے چلا جاتا تھا۔ جب کبھی راستہ میں مولانا اس کو نظر پڑتے تھے تو دور سے ٹوپی اتارتا اور سر جھکا کر سلام کرتا۔ مولانا مرحوم کی صداقت، ان کی حقانیت، ان کی للہیت تقویٰ وطہارت نے فقط احباب ہی کے دل پر سکہ نہ جمایا تھا بلکہ مخالف بھی ان کی وقعت دل میں بہت زیادہ رکھتا تھا اور معاملہ عظمت ہی کا برتتا تھا۔ بڑے بڑے افسروں جرنیل اور کرنیل میجر باوجود انگریز ہونے اور اس بات کے سمجھنے کے کہ مولانا ہمارے سیاسی امور میں مخالف ہیں ہماری موجودہ حکومت کو

ہند میں نہیں چاہتے تھے۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے خواہاں تھے اور اسلام اور مسلمانوں کی خلافت کے دوست ہیں۔ جب مولانا کو دیکھ لیتے تھے تو نہایت تعظیم سے پیش آتے تھے۔ ٹوپی اتار لیتے تھے اور بعض بعض تو بہت زیادہ جھک جاتے تھے، حقیقت تو یہ ہے کہ سچائی اور للّٰہیت ایک ایسی چیز ہے کہ ضرور بالضرور اپنا اثر پیدا کر دیتی ہے۔"

شیخ الہندؒ کے مشاغل: "مولانا عشا کی نماز کے بعد بہت تھوڑی دیر جاگتے تھے کچھ اپنے اوراد پڑھتے تھے اور پھر پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر اکثر وضو فرماتے۔ کبھی کبھی کچھ باتیں بھی کرتے اور پھر سو جاتے تھے۔ کیونکہ دس بجے کے بعد حکماً روشنیاں بجھا دی جاتی تھیں۔ جہاں دس بجے اسی وقت سپاہی آواز دیتا تھا سب چراغ اور موم بتیاں بجھانی پڑتی تھیں اور پھر تمام شب جلانے کی اجازت نہ ہوتی جہاں جہاں کمروں میں برقی روشنیاں تھیں وہاں پر خود ہی بجھ جاتی تھیں۔ البتہ پھر وہ برقی روشنیاں جو کیمپ اور راستوں کی روشنی کے لئے تھیں وہ تمام رات جلا کرتی تھیں ان کا تار برقی کمروں کی روشنی کے تار سے الگ تھا۔ الغرض دس بجے سب لوگ سو جاتے تھے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ تقریباً ایک بجے یا ڈیڑھ بجے شب کو اٹھتے اور نہایت دبے پیروں نکلتے۔ دروازے سے باہر تشریف لے جاتے۔ پیشاب سے فارغ ہو کر وضو فرماتے تھے۔ گرمیوں میں تو گرم پانی کی ضرورت ہوتی ہی نہ تھی نل کا پانی مناسب ہوتا تھا سردی کے زمانہ میں ہم نے یہ خاص انتظام کیا تھا کہ چولھے پر کھانے کے بعد ایک بہت بڑے ٹین کے لوٹے میں جو کہ چائے کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے ملتا تھا۔ اور اس میں نیچے ٹینٹو پیدا لگی ہوئی تھی۔ اور اس میں ہمارے معمولی دس بارہ لوٹے پانی آجاتا تھا۔ پانی خوب گرم کر لیا جاتا تھا۔ اور پھر اسی پاس والے کمرہ میں جہاں

نل لگا ہوا تھا۔ اس لکڑی کے تخت پر جس پر سب کپڑے دھوتے تھے۔ ایک کمبل میں لپیٹ کر عشا کے بعد رکھ دیتے تھے۔ پانی صبح تک خوب گرم رہتا تھا۔ حالانکہ سردی بہت زیادہ پڑی تھی۔ الغرض مولانا کو شب میں جتنی دفعہ وضو کی ضرورت ہوتی تھی اسی سے پانی لیتے تھے اور وضو فرماتے تھے اور مسجد کے کمرہ میں محراب کے دائیں جانب مولانا کی سفید اونی جانماز کمبلوں پر ہمیشہ بچھی رہتی تھی۔ اندھیرے میں جاکر اس پر نماز تہجد ادا فرماتے تھے، جب اس سے فارغ ہو جاتے تو پھر آکر اپنی چارپائی پر بیٹھ جاتے تھے اور صبح تک مراقبہ اور ذکر خفی میں مشغول رہتے تھے۔ ہزار دانوں کی تسبیح ہمیشہ سرہانے رکھی رہتی تھی۔ اسم ذات کی کوئی مقدار معین کر رکھی تھی، اس کو ہمیشہ بالالتزام پورا فرماتے تھے۔ مراقبہ کا اس قدر انہماک ہو گیا تھا۔ اکثر حصہ دن رات کا اس میں گذرتا تھا۔ استغراق بعض اوقات میں غالب ہو جاتا تھا ہم بعض اوقات دو دو تین تین دفعہ باتیں دہراتے تھے مگر سمجھتے نہ تھے۔ صبح کی نماز سے پہلے اکثر پیشاب کرتے اور وضو کی تجدید فرما کر نماز باجماعت ادا فرما کر وہیں مصلے (سجادہ) پر آفتاب کے بلند ہونے تک مراقب رہتے تھے اس کے بعد اشراق کی نماز ادا فرما کر اپنے کمرے میں تشریف لاتے اس وقت مولانا کے لئے ابلے ہوئے انڈے اور چائے تیار ہوتی تھی، وہ پیش کر دی جاتی تھی اس کو نوش فرما کر دلائل الخیرات اور قرآن شریف کی تلاوت فرماتے تھے اس سے فارغ ہو کر کچھ ترجمہ قرآن فرماتے یا اس پر نظر ثانی کرتے۔ یا اگر خط لکھنے کا دن ہوتا تو خط تحریر فرماتے یا وحید کو سبق پڑھاتے۔ اتنے میں کھانے کا وقت آجاتا کھانا تناول فرما کر چائے نوش فرماتے تھے۔ اس کے بعد اگر کسی سے ملنے کے لئے وردالہ یا سینٹ کلیمنٹ کیمپ یا بلغار کیمپ میں جانا ہوتا تو وہاں کا قصد فرماتے اور کپڑے پہن کر تیار ہو جاتے تھے اور اگر جانے کا قصد نہ ہوتا تو آرام فرماتے اور اگر کوئی ملنے کے

لئے دوسرے کیمپ میں سے آجاتا تو اس سے باتیں کرتے۔ اگر تیز گرمی کا زمانہ ہوتا
تھا تب تو وہیں اپنی چارپائی پر اور اگر کچھ بھی سردی ہوتی تھی تو صحن میں دھوپ
میں قیلولہ فرماتے تھے۔ وہاں پر ہم سب دو تین گدے ڈال دیتے تھے اور اس پر
کمبل اور تکیہ پہونچا دیا جاتا تھا۔ اور اگر کسی نے غفلت کی تو خود تکیہ لے جاتے۔ اور ان
گدّوں اور کمبل کو بچھا کر آرام فرماتے تھے۔ دو تین گدّے ہم نے زائد اسی واسطے
لے رکھے تھے جو کہ ہمیشہ علیٰحدہ رکھے رہتے تھے اور جب تک وہ حاصل نہ ہوتے تھے
تو بعض چارپائیوں کے گدّے اٹھا لئے جاتے تھے۔ گاڑھے کی ببول سے رنگی ہوئی
چادر اوڑھ کر دھوپ میں آرام فرمایا کرتے تھے یہی عادت مولانا کی وطن میں بھی
تھی۔ تقریباً ڈیڑھ یا دو گھنٹہ اس طرح آرام فرمانے کے بعد قضائے حاجت کے لئے
تشریف لے جاتے اور پھر وضو فرمانے کے بعد نماز ادا کرتے۔

یو۔پی میں حضرت شیخ الہند کی رہائی کی کوششیں جاری تھیں۔ گورنر مسٹر مسٹن
کے سیکریٹری مسٹر برن لندن جارہے تھے انھیں مالٹا میں اتر کر جائزہ لینے کی
ہدایت دی گئی۔ مسٹر برن نے جو اردو اچھی طرح جانتے تھے حکیم نصرت حسین
کو رہائی کی پیش کش کی۔ انھوں نے ساتھیوں کے بغیر رہا ہونے سے
انکار کر دیا۔ مسٹر برن کی ملاقات کے کافی مدت کے بعد رہائی کا حکم ہوا۔
۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو زندانیوں کے اس قافلہ کو سرکاری حراست میں
مالٹا سے روانہ کیا گیا۔ سیدی بشر کیمپ (مصر) میں ۱۸ دن اور سویز میں پونے
دو ماہ رکھے گئے۔ اس کے بعد ۸ جون ۱۹۲۰ء کو ان حضرات کو بمبئی
پہونچایا گیا۔ وطن کی سرزمین پر پاؤں رکھنے کے بعد یہ آزاد شمار
ہوئے۔ اس طرح قید کی کل مدت چار برس سات مہینے کے لگ
بھگ شمار ہوگی۔

اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مالٹا میں حضرت شیخ الہندؒ کے جو شاگرد اور جاں نثار ان کے ساتھ نظر بند رہے مختصر طور پر ان کا بھی تعارف کرا دیا جائے

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ آپ موضع اللہ داد پور ٹانڈہ ضلع فیض آباد (یو پی) میں حسینی سادات کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد محترم سید حبیب اللہ صاحب بانگر مؤ ضلع اناؤ میں ہیڈ ماسٹر تھے وہیں ۱۲۹۶ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ پرائمری تعلیم کے بعد ۱۳۰۹ھ میں دیوبند حاضر ہوئے اور ابتدائی درجہ عربی میں داخل ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۲ برس تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کی صلاحیتوں کو اپنی فراست سے پہچان لیا تھا۔ اپنی سرپرستی اور نگرانی میں رکھا باوجودیکہ حضرت شیخ الہندؒ بڑی جماعتوں کو پڑھاتے تھے لیکن بکمال مہربانی مولانا مدنیؒ کو بہت سی ابتدائی کتابیں الگ اوقات میں پڑھائیں۔ ۷ برس کی مدت میں نصاب مکمل کر لیا اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہو کر طریقت کی منزلیں طے کرنی شروع کر دیں۔ ۱۳۱۶ھ میں جب والد ماجدؒ نے جملہ اہل خاندان سمیت مکہ معظمہ کو ہجرت کی تو آپ بھی ہمراہ تھے۔ پیر و مرشد مولانا گنگوہیؒ نے انھیں مکہ معظمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجرؒ کی خدمت میں حاضری کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر آپ نے حضرت حاجی صاحبؒ کی نگرانی میں مراحل سلوک طے کئے، مکہ معظمہ میں جو مشہور کتب خانے تھے۔ ان سے پورا استفادہ کیا۔ آپ کو یہ شرف حاصل ہے کہ ۱۷ برس تک مسجد نبوی میں درس حدیث دیا۔ مدینہ منورہ کے قیام کے زمانہ میں اس خاندان کو ابتلاؤ آزمائش کے طویل دور سے گذرنا پڑا۔ اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ آپ بھی گرفتار کئے گئے۔ اور مالٹا میں نظر بند رہے۔ آپ کے بھتیجے مولانا

وحید احمد مدنی بھی مالٹا میں نظر بند تھے۔ اسی زمانہ میں شریف مکہ کی بغاوت کے بعد والد ماجد اور دونوں بھائیوں مولانا سید احمد صاحبؒ اور محمود احمدؒ کو دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ ترکی حکومت نے گرفتار کر کے الگ الگ مقامات پر مقید کر دیا۔ والد ماجد کا انتقال ایڈریانوپل (ادرنہ) میں ہوا۔ صرف بچے اور عورتیں مدینہ منورہ میں رہ گئیں اس زمانہ میں ایک رشتہ دار مولانا عبدالحق مدنیؒ حسب استطاعت ان کی خبر گیری کرتے تھے۔ ایک فرزند اشفاق احمد اور مولانا مدنی کی والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ اس مدت میں ان کے خاندان کے کل چھ افراد راہی ملک عدم ہوئے۔ مالٹا کی نظر بندی سے واپسی کے بعد حضرت شیخ الاسلام اپنی وفات ۱۲ جمادی الاوّل ۱۳۷۷ھ مطابق نومبر ۱۹۵۷ء تک ایک طرف ہندوستان کی سرگرم سیاست میں حصہ لیتے رہے دوسری طرف دارالعلوم دیوبند کی مسند تدریس پر فائز رہے۔ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں علامہ انور شاہ کشمیری کی علیحدگی کے بعد آپ دارالعلوم کی مسند صدارت پر فائز ہوئے۔ ہندوستان کے علاوہ پاکستان اور دیگر بیرونی ممالک میں آپ کے ہزاروں شاگرد اور لاکھوں مرید پھیلے ہوئے ہیں۔ دو ضخیم جلدوں میں نقش حیات، آپ کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ آپ کی متعدد تصنیفات ہیں۔ آپ کے مکتوبات چار جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند کے مختلف اجلاسوں کی صدارت کی۔ مالٹا کے بعد بھی جنگ آزادی کے مختلف مرحلوں میں جیل گئے۔

انگریزی حکومت کے خلاف فتوے کی پاداش میں دیگر رہنماؤں کے ساتھ آپ کو بھی مقدمہ کراچی میں سزا ہوئی۔ مقدمہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں شروع ہوا تھا۔ سزا کے بعد ۱۹۲۳ء میں رہائی عمل میں آئی۔ آپ متحدہ قومیت کے علم بردار تھے۔ اپنے ان نظریات کی خاطر مختلف مواقع پر مسلم لیگیوں کی بے جا حرکتوں

اور بے ہودگیوں کا نشانہ بنے۔ ایک زمانہ میں آپ کے خلاف طوفان بدتمیزی کھڑا کر دیا گیا تھا۔ آپ نے ان سب مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور انبیا کی راہ پر چلنے کا عملی ثبوت دیا۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اس خاندان نے جو قربانیاں دی ہیں اس کی مثال کم ملے گی۔ مولانا مدنیؒ ہی کے فرزند مولانا سید اسعد مدنی اس وقت جمعیۃ علماء ہند کے صدر ہیں اور واقعی معنیٰ میں اپنے والد مرحوم کے جانشین ہیں، آپ دیوبند کی سرزمین ہی میں آسودہ خاک ہیں مولانا حسین احمد مدنیؒ کو دیکھ کر قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ وہ جلیل القدر عالم دین اور رہنمائے طریقت تھے۔ وہ زاہد شب بیدار تھے۔ اور قوم سے انھیں ایسی ہی محبت تھی جیسی باپ کو اپنے بچوں سے۔ آپ کی زندگی بے شمار سیاسی طوفانوں سے گذری افسوس ہے کہ قوم نے جہاد آزادی کے اس عظیم سپاہی کو فراموش کر دیا

مولانا عزیر گل: آپ کا وطن زیارت کا کا صاحب (ضلع پشاور) ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے اساتذہ سے حاصل کی پھر دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور شیخ الہندؒ سے رابطہ پیدا کر کے ان کے خادم خاص بن گئے۔ دیوبند میں ہمہ وقت حاضر خدمت رہتے تھے۔ تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں چل سکا۔ بوقت گرفتاری (۱۹۱۶ء) اگر عمر ۲۵ برس شمار کی جاتے تو اس وقت آپ کی عمر ۹۵ برس ہونی چاہیے۔ تادم تحریر آپ حیات ہیں اور زیارت کا کا صاحب میں رہائش پذیر ہیں۔ مولانا مدنیؒ نے نقش حیات میں تفصیل کے ساتھ آپ کے حالات لکھے ہیں۔ ذیل میں اس کا خلاصہ دیا جاتا ہے۔

مولانا عزیر گل شیخ الہندؒ کے خادم خاص اور مشن کے ابتدا سے ممبر رہے۔ انتہائی خطرناک کاموں کو انجام دیتے رہے۔ صوبہ سرحد اور آزاد علاقہ (یاغستان) میں سفارت کی خدمات عظیم انھوں نے انجام دیں۔ شیخ الہند پہاڑی علاقوں

میں ہم خیال اور ہم نوا لوگوں کے پاس ان کو بھیجا کرتے تھے پہاڑی علاقوں اور ہولناک جنگلوں کو رات دن پیدل قطع کرتے رہے۔ حاجی ترنگ زئی اور علمار سرحد و یاغستان اور دیگر خوا تین کو آپ نے مشن کا ممبر بنایا۔ حضرت شیخ الہند کے سفر حجاز میں یہ بھی تھے۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں ہمہ وقت ساتھ رہے۔ جس زمانہ میں جیزہ (قاہرہ کے قریب) کے جیل خانہ میں انھیں رکھا گیا تھا۔ سب کو یقین ہو گیا تھا کہ موت کی سزا دی جائے گی۔

مولانا مدنی رح لکھتے ہیں:

"مولوی عزیر گل صاحب تو اپنی کوٹھڑی میں رہ کر اپنی گردن اور گلے کو پھانسی کے لئے ناپتے اور دباتے تھے کہ ذرا عادت ہو جائے اور پھانسی کے وقت یکبارگی تکلیف سخت نہ پیش آئے اور تجربہ کرتے تھے کہ دیکھوں کس قسم کی تکلیف ہوتی ہے۔"

مولانا عزیر گل انتہائی دلجمعی سے شریک و رفیق رہے حضرت شیخ الہند رح نے جو اعمال متعین کئے تھے ان میں مشغول رہتے تھے۔ ترکی زبان سیکھ لی۔ انگریزی زبان بھی سیکھنے کی کوشش کی۔ رہائی کے بعد حضرت شیخ الہند کے ہمراہ دیوبند میں ہی قیام کیا۔

مولانا عزیر گل نے پوری سرگرمی سے تحریک خلافت میں حصہ۔ خلافت کمیٹی دیوبند کے صدر بنائے گئے۔ مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں صدر مدرس رہے۔ مارچ ۱۹۴۵ء میں آپ وطن تشریف لے گئے۔ زمانہ قید میں اہلیہ محترمہ فوت ہو گئی تھیں۔ رہائی کے بعد شیخ الہند رح کی بھانجی کی لڑکی سے آپ کا عقد ہو گیا۔ ان سے آپ کے دو لڑکے اور لڑکیاں ہوئیں۔ اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ رڑکی میں ایک شریف یورپین بیوہ خاتون تھیں۔ اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد مسلمان ہو گئیں

انھوں نے مولانا عزیر گل کو پیغام دیا۔ آپ نے شادی کرلی۔ یوروپین خاتون نے ہر طرح کی وضع چھوڑ کر سادہ اسلامی وضع اختیار کرلی۔

مولانا حکیم سید نصرت حسینؒ: کوڑا جہان آباد ضلع فتحپور ہسوہ (یوپی) آپ کا وطن ہے۔ دار العلوم دیوبند میں تعلیم پائی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ہم جماعت رہے۔ فراغت کے بعد حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے۔ سفر حجاز میں آپ کے ساتھ تھے۔ مالٹا میں نظر بند کئے گئے۔ مصر میں جب ان سب سے پوچھ تاچھ ہو رہی تھی تو حکیم نصرت حسینؒ نے جو انگریزی بھی جانتے تھے بڑے قانونی ڈھنگ سے بات کی۔ اور حضرت شیخ الہندؒ کی طرف سے بھی وکالت کی۔ مالٹا میں نظر بندی کے زمانہ میں جب یو۔ پی کے گورنر مسٹر مسٹن کی طرف سے مسٹر برن آئے۔ انھوں نے حکیم صاحب کو رہائی کی پیش کش کی اور کہا تم پر کوئی الزام نہیں، آپ نے کہا چھوڑنا ہے تو ہم سبھوں کو چھوڑنا چاہئے۔ میں مولانا کو چھوڑ کر اگر ہندوستان چلا گیا تو تمام ہندوستان والے مجھے کھاجائیں گے اور کہیں گے کہ تم مولانا کو پھنسوا کر اکیلے چلے آئے۔ میں اکیلا ہرگز نہیں جانا چاہتا۔

بعد میں انھوں نے بہت سمجھایا اور یہ بھی کہا آپ وہاں جاکر رہائی کی کوشش بھی کرسکتے ہیں۔ آپ ضعف معدہ کے شکار تھے۔ بیمار رہتے تھے۔ جب تیسری مرتبہ بیمار پڑے تب بھی حضرت شیخ الہندؒ نے ان سے کہا کہ تم درخواست دیدو۔ لیکن آپ نے جواب دیا۔ موت و حیات خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے جدا نہیں ہوسکتا۔

زمانہ قید میں اذکار و اشغال میں مصروف رہتے تھے۔ نماز تہجد کے انتہائی پابند تھے۔ جب بیماری (ٹائیفائڈ) بڑھی تو ہسپتال میں داخل کیا گیا کسی کو ساتھ رہنے کی اجازت نہیں ملی۔ ہاں ہر تیسرے دن ہسپتال جانے کی اجازت مل گئی۔ آپ کی حالت ہسپتال میں بگڑتی گئی۔ ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ ۸ رتاریخ کو ہسپتال

میں وفات پائی۔ دوسرے دن جب ہسپتال کے لئے رفیقان زنداں اجازت لینے گئے تو اطلاع دی گئی کہ وفات ہو چکی ہے۔ چونکہ ڈاکٹرں نے مرض نمونیہ (متعدی) تجویز کیا تھا اس لئے نہلانے اور کفنانے کی اجازت بھی نہیں مل رہی تھی شدید احتجاج کے بعد کفنانے کی اجازت ملی۔ اس دوران میں تیمم کرادیا گیا۔ ویسے ہسپتال والوں نے پہلے ہی نہلا دیا تھا۔ مالٹا کے قبرستان میں اس غریب الوطن مجاہد آزادی کو دفن کیا گیا اور ایک کتبہ لگا دیا گیا۔

مولانا وحید احمد مدنی: شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بڑے بھائی مولانا سید صدیق احمد صاحبؒ تھے۔ مولانا وحید احمد ان ہی کے فرزند تھے۔ ہوش سنبھالا تو والد محترم وفات پا چکے تھے۔ چچا مولانا حسین احمد مدنیؒ نے شفقت کے ساتھ ان کو پالا۔ شیخ الہندؒ حجاز پہونچے تو ان سے وابستہ ہو گئے۔ شیخ الہند کے ساتھ آپ کو بھی گرفتار کیا گیا۔ مصر میں ایک کال کوٹھری میں آپ کو بھی رکھا گیا تھا۔ آپ کا بیان بھی بزرگوں کی طرح پختہ کارانہ تھا، مولانا سید محمد میاںؒ نے اسیران مالٹا میں ان کے بارے میں جو لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے۔

مالٹا میں دو بزرگوں کے زیر سایہ تھے۔ ان سے تربیت بھی حاصل کی اور تعلیم بھی۔ مالٹا سے رہا ہوئے تو حجاز کی بجائے اپنے چچا کے ساتھ ہندوستان ہی میں قیام کیا۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں مظفر نگر سے ماہانہ رسالہ جمیل جاری ہوا آپ اس کے مدیر رہے۔ کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں معین المدرسین کی حیثیت سے درس دیا پھر مدرسہ عزیزیہ بہار کے صدر مدرس ہو گئے۔ حافظہ قوی تھا۔ مالٹا میں اور مالٹا کے علاوہ جن ساتھیوں کے ساتھ رہنا ہوا ان کی زبان سیکھ لی۔ عربی اور اردو مادری زبانیں تھیں۔ فارسی، انگریزی سیقاً حاصل کیں، ترکی، فرانسیسی مالٹا میں نظر بند

باشندوں سے پشتو، بنگلہ اور کچھ دوسری زبانیں احباب کی مجلسوں میں سیکھیں اس طرح تقریباً دس زبانیں سیکھ لی تھیں۔

طاعون کی وبا کے زمانہ میں دسمبر سنہ ۱۹۳۸ء میں وطن ٹانڈہ ہی میں وفات پائی دو صاحب زادیاں اور تین صاحب زادے یادگار چھوڑے۔ بڑے صاحبزادہ مولانا فرید الوحیدی حجاز شریف میں مقیم ہیں۔ دوسرے صاحب زادہ مولانا رشید الوحیدی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں لیکچرار ہیں تیسرے صاحب زادہ مولانا سعید احمد مظفر نگر میں ڈاکٹر ہیں۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ایک نادر تصویر
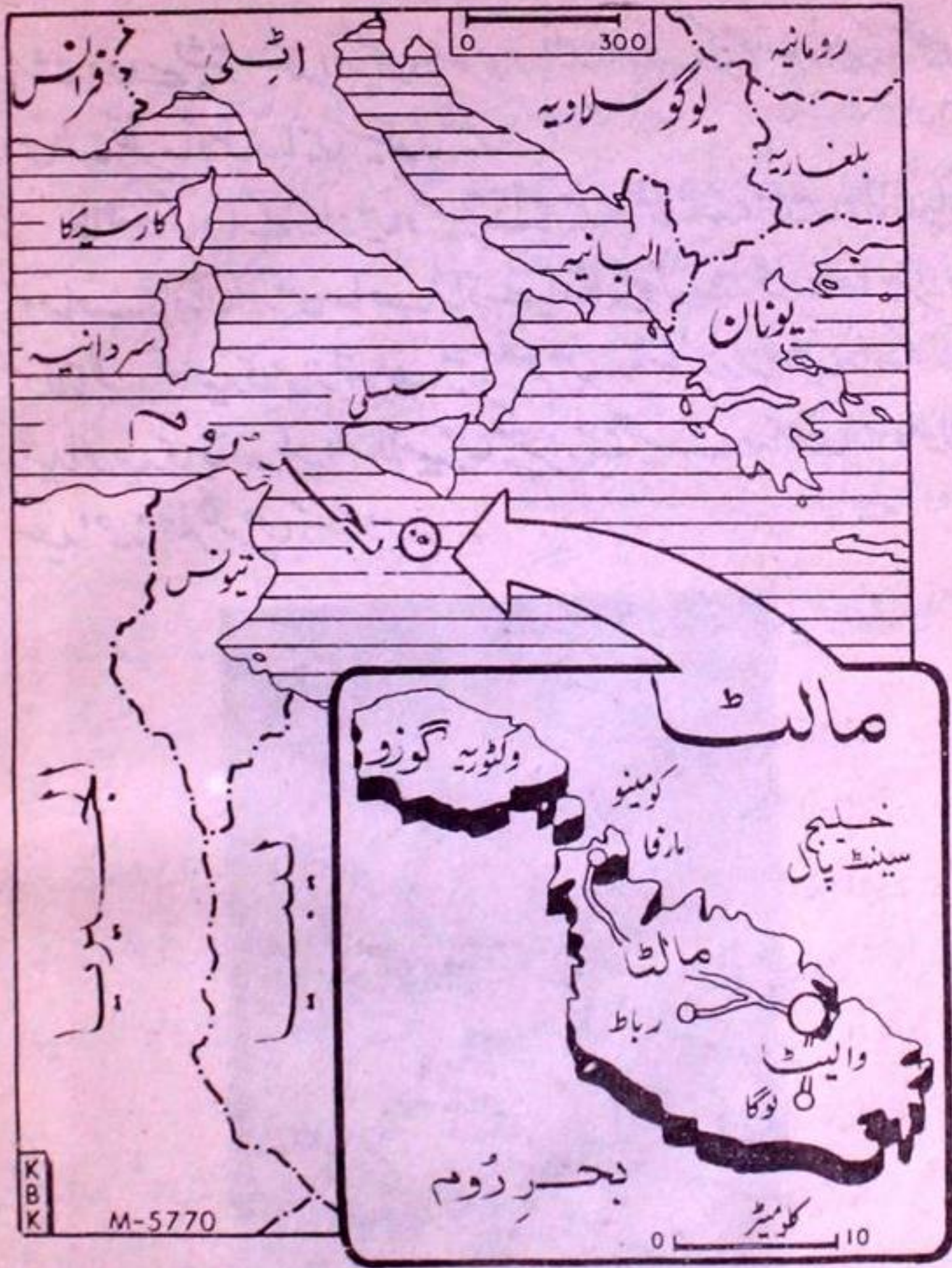
جزیرہ مالٹا، جہاں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور اُن کے رفقا کو ایک قلعہ میں نظر بند رکھا گیا۔ جزیرہ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ یونانیوں، رومیوں اور ترکوں کی حکومت اس پر رہی اخیر میں برطانیہ کا تسلط رہا۔ جس سے ۱۹۶۲ء میں آزادی حاصل کی۔

حضرت شیخ الہندؒ کا فتویٰ

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ امر باعث فخر ہے کہ ترک موالات یا عدم تعاون کی تحریک کا آغاز انھوں نے کیا۔ ہندو بھائیوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ خلافت کے سلسلہ میں شروع ہونے والی اس تحریک نے بہت ہی جلد قومی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ ۹ جون ۱۹۲۰ء کو خلافت کانفرنس منعقدہ الہ آباد میں متفقہ طور پر ترک موالات کا ریزولیوشن منظور کیا گیا۔ ایک کمیٹی بنادی گئی تھی۔ جس کا یہ کام تھا کہ ترک موالات کا تفصیلی پروگرام طے کرے۔ ۲۲ جون ۱۹۲۰ء کو مسلمانوں نے وائسرائے کو پیغام بھیجا کہ اگر یکم اگست ۱۹۲۰ء تک ترکوں کی شکایات رفع نہ ہوئیں تو تحریک ترک تعاون شروع کر دی جائے گی۔ ۳۰ جون ۱۹۲۰ء کو پھر خلافت کمیٹی کا اجلاس الہ آباد میں ہوا اس میں وائسرائے کو نوٹس دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ یکم اگست ۱۹۲۰ء کو نوٹس جاری کیا گیا اور ۳۱ اگست ۱۹۲۰ء کو عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی گئی۔

ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں کانگریس کے خصوصی اجلاس میں مہاتما گاندھی نے ترک موالات کی تجویز پیش کی۔ اس کی تائید کرنے والوں میں حکیم محمد اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔

یہ تحریک جاری تھی لیکن ابھی اس کے متعلق کسی طرح کی کوئی مذہبی تحریر نہیں منظر عام پر آئی تھی۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا فتویٰ

منظرِ عام پر آیا۔ جو بعد میں نومبر ۱۹۲۰ء کے اجلاس جمعیتہ علماء ہند (دہلی) میں ترک موالات کی تجاویز اور علماء کے فتوے کی بنیاد بنا۔ جس کا ذکر پچھلے باب میں گذر چکا اس کا مطلب یہ ہے کہ مالٹا سے رہائی اور واپسی کے بعد جب کہ حضرت شیخ الہندؒ کی جسمانی صحت تقریباً جواب دے چکی تھی فرنگی اقتدار پر کاری ضرب لگانے والے حضرت شیخ الہند ہی تھے۔ تحریک عدم تعاون کے نتیجہ میں حکومت برطانیہ کچھ مدت کے لئے ہل ضرور گئی تھی۔ مولانا کے فتوے نے نہ صرف تحریک کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔ بلکہ سارے عالم اسلام کو فرنگی اقتدار کے خلاف برانگیختہ کر دیا تھا۔ ہندوستان برطانوی حکومت کی ریڑھ کی ہڈّی تھا۔ ہندوستان کی دولت، خام مال اور افرادی طاقت کے بل بوتے پر برطانیہ نے اپنی سلطنت کو کرۂ ارض پر اس حد تک وسعت دی کہ اس میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ استفتاء اور حضرت شیخ الہندؒ کے فتوے کو لفظ بلفظ پیش کر دیا جائے۔

استفتاء: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں۔

۱۔ اس وقت جو گورنمنٹ سے مدارس میں بضرورت زیادتی اخراجات مدارس کی امداد لی جاتی ہے۔ اس امداد کا ترک موالات کی وجہ سے لینا جائز ہے یا نہیں۔

۲۔ جو وظائف کہ سرکار کی طرف سے طلباء کو اور خطاب یافتہ اصحاب کو ملتے ہیں ان کا لینا ان کو جائز ہے یا نہیں۔

۳۔ طلبا کے ذمّہ والدین یا دیگر مربّیوں (سرپرستوں) کو بغیر اطلاع دیئے ہوئے یا ان کے خلاف مرضی ایسے مدارس کو چھوڑ دینا واجب ہے یا نہیں۔؟

۴۔ جن کا نان نفقہ طلبا کے اوپر فرض عین ہے۔ مثلاً اولاد، زوجہ یا ضعیف والدین ان کو چھوڑ کر ہم کو لوجہ اللہ خلافت کے کام میں لگ جانا ضروری ہے یا نہیں؟

۵۔ جن مدارس میں سرکاری امداد لی جاتی ہے یا جو والیٔ ریاست ترک موالات یا مسئلہ خلافت کے مخالف ہوں اور ان سے کچھ رقم ملتی ہے۔ ایسے مدارس میں پڑھنا یا پڑھانا، یا ان میں امامت، وعظ و نصیحت یا مذہبی تعلیم دینے کے امور کے انتظام کرنے کی ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۶۔ اپنے ذاتی اخراجات کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جن کا نان نفقہ اس کے ذمہ فرض ہے بقدر ما یکفی (گذارہ لائق) خلافت کے بیت المال سے لینا جائز ہے یا نہیں؟

۷۔ ان لوگوں سے کیا معاملہ رکھنا چاہیئے جو سرکاری ملازم ہیں یا ایسے مدارس میں ملازم ہیں جن کو سرکار سے امداد ملتی ہے۔

۸۔ مسئلہ خلافت اور ترک موالات میں اہل ہنود سے اتحاد رکھنا اور ان سے امداد و اعانت (یعنی خواہ مالی ہو یا زبانی یا اور کسی قسم کی ہو) جائز ہے یا نہیں

۹۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ (اینگلو۔ محمڈن اورنٹیل کالج) کے دوامی فنڈ کا روپیہ یا اس کی عمارتیں جو تقریباً ۴۰ لاکھ روپے کی ہیں۔ اور کتب خانہ جو رقم کثیر کا ہے اور دیگر حوائج (ضروریات) کی اشیا جو ہزارہا روپے مالیت کی ہیں۔ ان تمام چیزوں کی حفاظت اور ہر چیز کو اپنے مصرف میں صرف کرنا ممبران مدرسہ کے ذمہ فرض ہے یا نہیں۔

۱۰۔ جو طلبا انگریزی خواں ہیں۔ ان کے لئے شرعاً ضروری ہے کہ وہ علم دین کی تکمیل میں مشغول ہوں تاکہ فارغ التحصیل ہو کر دوسروں کو تعلیم دیتے رہیں یا ایسے طلبار کو اس وقت ترک موالات و خلافت کو کامیاب بنانا ضروری ہے۔ خلاصہ سوال یہ ہے کہ تکمیل علوم دینیہ کو ترجیح ہے یا ترک موالات و خلافت کے کام میں مشغول ہونے کو۔

(طلبا مدرسۃ العلوم علی گڑھ ماہ صفر ۱۳۳۹ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب:

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

ان مسائل کا جواب سننے سے پہلے نہایت ضروری ہے کہ ایک مسلم صادق تمام گردوپیش کے خیالات سے علیحدہ ہو کر اپنے ایمان کی قدر وقیمت اور شعائر الٰہیہ (حدود خداوندی) کی عظمت اور مقامات مقدسہ کے تقدس واحترام کو اچھی طرح دل نشیں کرے۔ اور دروس ماضیہ کے ساتھ واقعات حاضرہ پر گہری نظر ڈالے تو اسے معلوم ہوگا کہ آج مسلمانوں کی سب سے بڑی متاع گرانمایہ (جس کا تحفظ ہر ایمان رکھنے والے کا اولین فرض ہے) کس طرح لوٹی جارہی ہے۔ اور کن کن بدعہدیوں اور شرمناک عیاریوں اور روباہ بازیوں (لومڑی جیسی مکاریوں) سے جزیرۃ العرب کے متعلق پیغمبر اسلام (فداہ ابی وامی) کی سب سے اہم وصیت کا مقابلہ کیا جارہا ہے۔

اعداء اللہ نے اسلام کی عزت اور شوکت کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ عراق، فلسطین اور شام جن کو صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم نے خون کی ندیاں بہا کر فتح کیا تھا پھر کفّار کی حریصانہ حوصلہ مندیوں کی جولانگاہ بن گئے۔ پیراہن خلافت کی دھجیاں اڑادی گئیں۔ خلیفۃ المسلمین جس کی ہستی سے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کی ہستیوں کا شیرازہ بندھتا ہے اور جو بحیثیت ظل اللہ فی الارض ہونے کے آسمانی قانون کو رائج کرنے والا اور مسلمانوں کے حقوق ومصالح کا محافظ اور شعائر اللہ کی صیانت (حفاظت) کا ضامن اور کلمۃ اللہ کی رفعت وسربلندی کا

کفیل تھا۔ وہ بھی بے شمار دشمنوں کے نرغہ میں پھنس کر بے دست وپا ہو چکا ہے

صبّت علیّ مصائب لو انّھا
صبّت علی الایّام صرن لیالیا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا جھنڈا (خاکم بدہن) سرنگوں ہوا جا رہا ہے۔ حضرت ابو عبیدہ، سعد بن ابی وقاص، خالد بن ولید اور ابو ایوّب انصاری رضی اللہ عنہم کی روحیں اپنی خوابگاہوں (قبروں) میں بے چین ہیں۔ یہ سب کیوں ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں میں سے غیرت وحمیت مفقود ہو رہی ہے۔ جو جرأت اور مذہبی حرارت ان کی میراث تھی وہ انھوں نے غفلت اور تعیش کے نشہ میں دوسروں کے حوالہ کر دی ہے۔

یہی نہیں کہ اس مصیبت کے وقت ایک مسلمان نے مسلمان کی مدد نہیں کی۔ بلکہ قیامت تو یہ ہے کہ کفار کی موالات واعانت اور وفاداری کے شوق میں ایک مسلمان نے دوسرے کی گردن کاٹی۔ بھائی نے بھائی کا خون پیا اور دشمنوں کے سامنے سُرخرو ہونے کے لئے اپنے ہاتھ اپنے ہی خون میں رنگے۔

اے فرزندان اسلام! اور اے محبّان ملت و وطن! آپ کو مجھ سے زیادہ معلوم ہے کہ جس برق مسلم سوز نے ان بلاد اسلامیہ کے خرمن آزادی کو جلایا اور خلافت اسلامیہ کے قصر کو آگ لگائی۔ اس کا اصل ہیولی (مادّہ) عربوں اور ہندوستانیوں کے خون گرم سے تیار ہوا تھا۔ اور جس دولت سے نصاریٰ ان ممالک مقدسہ میں کامیاب ہوئے اس کا بہت بڑا حصہ بھی تمہارے ہی دست و بازو سے کمایا ہوا ہے۔

پس کیا اب بھی کوئی ایسا بلید (کند) اور غبی مسلمان پایا جاتا ہے جس کو نصاریٰ کے موالات ومناصرت (باہمی امداد) کے نتائج قطعیہ معلوم نہ ہوئے ہوں اور

ایسی تشویشناک حالت میں جب کہ ڈوبتا ہوا آدمی ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈھتا ہے وہ اس فکر میں ہو کہ کوئی صورت موالات کے جواز کی نکالے۔

اے میرے عزیزو! یہ وقت استحباب اور فرضیت کی بحث کا نہیں ہے۔ بلکہ غیرت اسلامی اور حمیت دینی سے کام لینے کا ہے۔ کہیں علمار زمانہ کا چھوٹا بڑا اختلاف تمہاری ہمتّوں کو پست اور تمہارے دلوں کو پژمردہ نہ کردے۔ میں اس وقت تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم تلوار لے کر جہاد کرو یا عراق وشام میں جاکر اپنے بھائیوں کا ساتھ دو بلکہ محض اس قدر درخواست کرتا ہوں کہ تم اپنے دشمنوں کے بازوؤں کو قوی مت بناؤ اور حق تعالیٰ شانہ کے ان ارشادات پر نہایت مستعدی اور جوانمردی اور اخلاص نیت سے عمل کرو۔

یا ایہا الذین اٰمنوا لا تتخذوا الیہود والنصٰرٰی اولیاء بعضہم اولیاء بعض ومن یتولّھم منکم فانّہ منہم۔ (الآیۃ)

ترجمہ: اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو اپنا دوست اور مددگار مت بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ اور جو کوئی تم میں سے ان کو دوست اور مددگار بنائے وہ بھی ان ہی میں سے ہے۔

لایتّخذ المومنون الکفرین اولیاء من دون المؤمنین ومن یفعل ذالک فلیس من اللہ فی شیٔ۔ (الآیۃ)

ترجمہ: مسلمانوں کو حق نہیں پہونچتا کہ وہ مومنین کے سوا کافروں کو اپنا دوست یا مددگار بنائیں۔ اور جو ایسا کرے گا اس کو اللہ سے کچھ سروکار نہیں۔

بشّر المنٰفقین بانّ لہم عذابًا الیمًا۔

ن الذین یتخذون الکٰفرین اولیاء من دون المؤمنین۔ ایبتغون عندھم العزۃ فان العزۃ للہ جمیعًا۔ (الآیۃ)

ترجمہ: ان منافقین کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو جو مومنین کے سوا کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں۔ کیا وہ ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں۔ اور اللہ ہی کیلئے تمام تر عزت ہے

یاایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا الکٰفرین اولیآء من دون المؤمنین۔ اتریدون ان تجعلوا للہ علیکم سلطانًا مُّبینًا۔ الآیۃ

ترجمہ: اے ایمان والو! تم ان اہل کتاب اور کافروں کو اپنا یار و مددگار مت بناؤ کیا تم لیا چاہتے ہو اپنے اوپر اللہ کا الزام صریح۔

ترٰی کثیرًا منھم یتولّون الّذین کفروا ط لبئس ماقدّمت لھم انفسھم ان سخط اللہ علیھم وفی العذاب ھم خٰلدون۔ ولو کانوا یومنون باللہ والنبیّ وما انزل الیہ ما اتخذوھم اولیاء ولکنّ کثیرًا منھم فٰسقون۔ الآیۃ

ترجمہ: ان میں بہت سے تم ایسے دیکھو گے جو رفیق بنتے ہیں کافروں کے۔ بیشک بُرا ہے وہ جو آگے بھیجا ہے انھوں نے خود اپنے نے۔ کہ اللہ کا غضب ہے ان پر۔ اور وہ ہمیشہ عذاب میں ہیں۔ اور اگر یقین رکھے وہ اللہ پر اور نبیؐ پر اور اس پر جو نبیؐ کی طرف اتارا گیا تو کافروں کو رفیق نہ بنائے۔ لیکن ان میں بہت سے نافرمان ہیں۔

لاتجد قومًا یومنون باللہ والیوم الآخر یوادّون من حادّ اللہ ورسولہ ولو کانوا آباءھم وابناءھم

او اخوانھم او عشیرتھم ط اولٰئک کتب فی قلوبھم والایمان و ایدھم بروح منہ ط ویدخلھم جنّت تجری من تحتھا الانھر خلدین فیھا ط رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ ط اولئک حزب اللہ ط الا ان حزب اللہ ھم المفلحون ۔ الآیۃ

ترجمہ: نہیں پاؤ گے تم کسی قوم کو جو یقین رکھتی ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر کہ وہ دوستی کرے ان سے جنھوں نے مقابلہ کیا اللہ کا اور اس کے رسول کا، اگرچہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا اور اپنی روح سے ان کی مدد فرمائی اور ان کو داخل کرے گا باغ بہشت میں جس کے نیچے بہتی ہیں نہریں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش اور وہ اللہ سے خوش۔ یہ جماعت ہے خدا کی۔ یاد رکھو کہ خدا کی جماعت ہی کامیاب ہے

یاایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیھم بالمودۃ وقد کفروا بما جاءکم من الحق ۔ الآیۃ

ترجمہ: اے ایمان والو! میرے دشمن اور اپنے دشمن کو رفیق مت بناؤ۔ پیغام بھیجتے ہو تم ان کی طرف دوستی کا حالانکہ وہ منکر ہوتے ہیں اس سچائی سے جو تمہارے پاس پہونچی ہے۔

⁂

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں بکثرت ہیں جن کا استیعاب مقصود نہیں مگر اس قدر واضح رہے کہ اولیاء کا ترجمہ جو ہم نے دوست اور مددگار سے کیا ہے اس کا ماخذ امام ابن جریر طبری، حافظ عماد الدین ابن کثیر اور امام فخر الدین رازی

وغیرھم اکابر مفسرین کی تصریحات ہیں۔ ہماری غرض صرف اسی قدر ہے کہ ترک موالات کے تحت میں جیسا کہ ان کی مدد کرنا داخل ہے اسی طرح ان کی امداد لینا بھی ہے۔ لہٰذا آپ کے سوال اول و دویم کا جواب یہ ہوگا کہ مدارس میں جو امداد گورنمنٹ سے لی جاتی ہے اور جو وظائف طلبا وغیرھم کو ملتے ہیں۔ وہ سب قابل ترک ہیں۔ اور اس ترک موالات میں طلبا اپنے والدین کی اجازت کے محتاج نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا حق ہے کہ وہ ادب و تہذیب کے ساتھ اپنے والدین کو بھی ترک موالات پر مستعد بنائیں۔ اس وقت جو خلیجان بعض طلبا کو پیش آرہا ہے۔ عہد نبوت میں بھی بعض مومنین کو پیش آیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ کفار سے بالکل علیحدگی اور قطع تعلق کس طرح ہو سکتا ہے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو اپنے ماں باپ اور بھائیوں اور اپنے خویش و اقارب سب سے چھوٹ جائیں گے۔ ہماری تجارتیں تباہ ہو جائیں گی ہمارے اموال ضائع ہو جائیں گے اور ہماری بستیاں اجڑ جائیں گی اس جواب حق تعالیٰ نے یہ عنایت فرمایا ہے۔

قل ان کان آباءکم و ابناءکم و اخوانکم و ازواجکم وعشیرتکم و اموال ن اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا ومسٰکین ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہٖ وجہادٍ فی سبیلہٖ فتربصوا حتّی یاتی با مراللہ، واللہ لا یھدی القوم الفٰسقین۔ الآیۃ

ترجمہ: کہہ دو کہ تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور مال جو تم نے کمایا ہے اور تجارت جس کی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو اور مکانات جو تم کو پسند ہیں۔ اگر یہ سب تم کو خدا اور خدا کے رسول اور خدا کی راہ

بس جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو منتظر رہو، تاکہ لے آئے اللہ اپنے حکم کو اور اللہ دست گیری نہیں کرتا اس قوم کی جو نافرمان ہے۔

* * *

کبھی دل میں یہ وسوسہ گذرتا ہے کہ خدانخواستہ یہ تحریکات جو ملک میں پھیل رہی ہیں اور گورنمنٹ اپنی ضد پر اڑی رہی تو ہم کو سخت ضرر پہونچنے کا اندیشہ ہے اس طرح کے خیالات اس زمانہ میں بھی پیش کئے گئے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ

(یعنی منافقین کہتے ہیں کہ ہمارے دوستانہ تعلقات یہود کے ساتھ اس لئے ہیں کہ زمانہ کی گردش سے کہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے ناکام ہوں اور یہود غالب آجائیں تو اس وقت ہمارے لئے بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا)

اس کا جواب حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا۔

فعسیٰ اللہ ان یاتی بالفتح او امر من عندہ فیصبحوا علیٰ ما اسروا فی انفسھم ندمین۔ الایۃ

ترجمہ: تو قریب ہے کہ لے آئے اللہ فتح یا کوئی اور بات اپنے پاس سے پھر منافقین ان خیالات پر نادم ہو کر رہ جائیں گے جو ان کے دل میں مکنون (چھپے ہوتے ہیں)

پس اے عزیزو! تم اللہ پر بھروسہ کر کے اور اس کی رسی کو مضبوط تھام کر اپنے عزم پر قائم رہو۔ اور موالات نصاریٰ کو ترک کرو اور اپنی استطاعت کے موافق جو خدمت گذاری اسلام اور اہل اسلام کی کر سکتے ہو، اس سے درگذر نہ کرو کہ اب وقت درگذر کا نہیں۔

حسن اتفاق سے اس وقت ہندوستان کی سب سے کثیر التعداد قوم (ہنود)

کا مطمح نظر بھی تمہاری ہمدردی اور واقعات پنجاب اور خواہش سیلف گورنمنٹ کی وجہ سے ترک موالات مع النصاریٰ (نصاریٰ سے عدم تعاون) ہے اور ابھی حال میں سُنا گیا ہے کہ سکھ لیگ نے بھی یہی فیصلہ کر لیا ہے۔ اس موقعہ کو غنیمت سمجھنا چاہیئے، تم اپنی نظر فقط خدا پر رکھو۔ تمہارا دوست اور مددگار صرف وہی ہے البتہ جو قومیں تمہارے اس پاک مقصد میں خود بخود شریک ہو جائیں یا تمہاری تائید و غمخواری کریں۔ ان سے تم بھی مصالحت اور رواداری کا برتاؤ کرو اور مبرّة و اقساط (مروت اور حسن سلوک) سے پیش آؤ۔

قرآن کریم میں ہے:

لا ینھٰکم اللہ عن الّذین لم یقاتلونکم فی الدّین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبرّوکم وتقسطوا الیھم، اِن اللہ یحب المقسطین ہ انما ینھٰکم اللہ عن الّذین قاتلوکم فی الدّین واخرجوکم مّن دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولّوھم ومن یّتولّھم فاولٰئک ھم الظالمون۔ الآیۃ

ترجمہ: اللہ ان لوگوں کے متعلق جو دین کے معاملہ میں تم سے نہیں لڑے اور نہ انھوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا، اس سے منع نہیں کرتا کہ تم ان کے ساتھ بھلائی اور منصفانہ سلوک کرو اور تمہارے نکالنے میں مددی اور جو لوگ ان سے دوستی رکھیں وہی ظالم ہیں۔

اس موقعہ پر اس قدر تنبیہہ ضرور ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے ان تعلقات کا اثر یہ نہ ہونا چاہیئے کہ مسلمان اپنے کسی مذہبی حکم کو بدلیں اور شعائر کفر و شرک کو اختیار کرنے لگیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو نیکی برباد گناہ لازم کی مثل اپنے اوپر منطبق کریں گے۔

میری غرض یہ ہے کہ آپ ترکِ موالات پر نہایت دیانت سے عمل کریں اور خالص خدا پر اپنی نظر رکھیں۔ اور جن طلبہ سے حقوق واجبہ فوت نہ ہوتے ہوں وہ اس تحریک کی تبلیغ میں حصہ لیں۔ بقدرِ ضرورت تعلیم دینی اور ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے بعد آج کل یہ مشغلہ نہایت سودمند ہے۔ حق تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ اور جن لوگوں کے ذمہ اولاد یا بیوی یا ماں باپ کے حقوق ہو وہ اسی حد تک اس کام میں حصہ لیں جہاں تک ان کی خبر گیری سے اغماض (غفلت) نہ ہو کہ وہ بھی فرض ہے۔ اور اگر خلافت کی امداد و حفاظت میں سعی کرنے والوں کو بقدر اس کی ضروریات کے خلافت کمیٹی اس چندہ میں سے جو اسی کام کے لئے کیا گیا ہو کچھ حق الخدمت دے اس کا لینا جائز ہے۔

الحاصل موالات کفّار حرام ہے اور جہاں تک قدرت ہو اپنے کو اور دوسروں کو موالات کفار سے علیحدہ رکھنا ضروری ہے اور ہر مسلمان کو چاہیئے کہ اپنی توجہ سب طرف سے ہٹا کر اسی ربّ العزت سے وابستہ کرے جس کے ہاتھ میں ہر ایک شاہ و گدا کی باگ ڈور ہے۔

مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار
بگذارند و سرِ طرّہ یارے گیرند

ترجمہ: میں نے اسی میں عافیت (بھلائی) دیکھی کہ دوست سب کام چھوڑ دیں اور کسی محبوب کی زلفوں کے اسیر ہو جائیں۔

اب بندہ التماس ختم کرتا ہے۔ اور اس قدر اور معروض ہے کہ بندہ کوئی مفتی نہیں۔ فتویٰ لکھنا دوسرے علماء کا کام ہے (بطور انکساری یہ بات لکھی ہے۔) تاہم امید ہے کہ میری معروضات سے آپ کو اپنے سوالات کا جواب مل جائے گا اور علی گڑھ کالج کی عمارتوں اور کتب خانوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ یہ خیال

بھی آپ کے دل کو دستک دے گا کہ قسطنطنیہ، شام، فلسطین اور عراق کی قیمت سے ان چیزوں کی قیمت کو کیا نسبت ہے۔ بالکل آخر میں مجھے یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ تحریک ترک موالات کا موجودہ حالت میں کامیاب بنانا صرف اسی پر منحصر ہے کہ کوئی حرکت ہماری طرف سے ایسی نہ ہونی چاہیئے، جو نقض امن یا سفک دمار (خونریزی) کی موجب ہو اور یہی نصیحت اس ملک کے تمام سربرآوردہ دانشمندوں کو ہے۔ اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لیا جائے ورنہ فائدہ کی جگہ نقصان کا اندیشہ ہے۔ (والسلام مورخہ ۱۲ صفر ۱۳۳۹ھ)

اب میری یہ التجا ہے کہ آپ سب حضرات بارگاہ رب العزت میں نہایت صدق دل سے دعا کریں کہ وہ ہماری قوم کو رسوا نہ کریں اور ہم کو کافروں کا تختہ مشق نہ بنائے اور ہمارے اچھے کاموں میں ہماری مدد فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

آپ کا خیر اندیش بندہ محمود عفی عنہ
۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء

یہ فتویٰ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو تحریر کیا گیا ہے اور مسئلہ پوچھنے والوں کا تعلق اے۔ ایم۔ او کالج علی گڑھ سے ہے۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء ہی کو علی گڑھ ہی میں شیخ الہند مولانا محمود حسن نے قومی یونیورسٹی یعنی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح کیا تھا۔

اس فتوے میں جہاں جہاں لفظ کفار استعمال ہوا ہے۔ اور ان سے ترک موالات کو واجب قرار دیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں جو قرآنی آیات پیش کی گئی ہیں۔ موقعہ کی مناسبت سے وہاں مفتی کی مراد نصاریٰ و برطانوی حکمراں ہیں۔ جن کے مقابلہ میں جنگ جاری تھی۔ ترک موالات یا عدم تعاون کے جتنے بھی شرعی احکام بیان ہوتے ہیں۔ ان کا اطلاق حالت جنگ پر ہوتا ہے۔ علمار کرام

نے انگریزی دور اقتدار میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا اور اس کی تفصیلی وجوہ بیان کی تھیں۔ سب سے پہلے شاہ عبدالعزیزؒ نے فرنگی اقتدار کے خلاف انتباہ دیتے ہوئے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان کے جمہور علماء خصوصاً دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کا یہی مسلک رہا، چونکہ برطانوی اقتدار میں مسلمانوں کے مذہبی احکام پر زد پڑ رہی تھی۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد بھی طویل مدت تک مسلمانوں پر برطانوی مظالم جاری رہے یہاں تک کہ خلافت کی تحریک کا زمانہ آیا۔ یہ تحریک ترکی پر اتحادیوں کے حملے اور مسلمانوں کے مقامات مقدسہ پر یوروپین ملکوں کے قبضہ کا مقابلہ کرنے کے لئے چلائی گئی تھی۔

فتوے میں جو قرآنی آیات پیش کی گئی ہیں ان میں بیشتر کا اطلاق حالت جنگ پر ہوتا ہے۔ ان آیات کی شان نزول یہ ہے کہ کفّار قریش نے اہل اسلام سے دشمنی باندھ رکھی تھی۔ جب تک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام مکہ میں رہے۔ کفّار قریش نے ایک دن بھی چین سے نہ رہنے دیا۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد بھی ان کی ریشہ دوانیاں اور حملے جاری رہے۔ مدینہ کے یہودی یا منافقین بھی ان کا ساتھ دیتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کو ترک موالات کی ہدایت کی گئی ـــــ تقریباً اسی سے ملتے جلتے حالات برطانوی دور حکومت میں مسلمانوں کو درپیش تھے۔ اس لئے قرآنی آیات کا اطلاق فرنگی حکام پر کیا گیا۔

جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس کی صدارت

جس زمانہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کے رفقا مالٹا میں نظر بند تھے۔ ہندوستانی سیاست کا منظر کافی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ اور اس کی اتحادی طاقتوں کو کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ برطانیہ نے جنگ سے پہلے قومی رہنماؤں سے جو وعدے کئے تھے ان سے یکسر مکر گیا تھا۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں جلیانوالہ باغ امرتسر کا خونیں واقعہ ہوا۔ ملک کے حریت پسندوں کے لئے یہ ایک کھلا چیلنج تھا۔

پہلی جنگ عظیم میں عملی طور پر سلطنت عثمانیہ پارہ پارہ ہو گئی۔ یوروپین طاقتوں کا اصل مقصد بھی یہی تھا۔ تاہم خلافت عثمانیہ کا برائے نام وجود استنبول میں برقرار تھا۔ اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں حریت پسند انگورہ کے مرکز میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ حریت پسند ترکوں نے یونانی حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور اپنی تمام تر بے سروسامانی کے باوجود اصل سرزمین ترکی، یا اناطولیہ (ایشیائے کوچک) کو دشمنوں سے آزاد رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ ادھر ہندوستانی مسلمانوں کی تشویش مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔ خلافت تحریک کا مقصد خلافت کو برقرار رکھنے میں مدد دینا تھا۔

ادھر حضرت شیخ الہندؒ کے حلقوں میں ایک نئی راہ اپنانے کا رجحان پیدا ہو چکا تھا۔ ــــ دیوبندی مکتب فکر کے علاوہ اور حلقوں کے علما بھی اس بات کو شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ قومی قیادت کا جو فریضہ ان پر عائد ہوتا ہے اس کے لئے ایک پلیٹ فارم ہونا

چاہیے۔ چنانچہ ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو دلی میں خلافت کانفرنس کے موقعہ پر جب علما بھاری تعداد میں اکٹھے ہوئے۔ انھوں نے اپنے ایک الگ اجلاس میں ایک تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس تنظیم کا نام جمعیۃ علماء ہند رکھا گیا۔ اس اجلاس میں جن ۲۵ علماء نے شرکت کی۔ ان میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، پیر محمد امام سندھی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا سید محمد داؤد، مولانا خواجہ غلام نظام الدین بدایونی، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ، مولانا حافظ احمد سعیدؒ، مولانا سید محمد فاخر (الہ آباد) اور مولانا محمد ابراہیم (دربھنگہ) بھی شامل تھے۔ اس جلسہ کی صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے کی۔

اجلاس میں تنظیم کے نام کی منظوری کے علاوہ عارضی طور پر تنظیم کا صدر مولانا مفتی محمد کفایت اللہؒ اور ناظم مولانا حافظ احمد سعیدؒ کو مقرر کیا گیا۔ علاوہ ازیں یہ طے پایا کہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں امرتسر میں مسلم لیگ کے اجلاس کے موقعہ پر جمعیۃ علما کا پہلا اجلاس منعقد کیا جائے۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کا پہلا اجلاس عام ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء سے یکم جنوری ۱۹۲۰ء تک مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں امرتسر میں منعقد ہوا اس اجلاس میں جمعیۃ علماء ہند کے اغراض و مقاصد اور اس کے اساسی اصولوں کا مسودہ پیش ہوا۔

جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی صدارت میں دلی میں منعقد ہوا۔ حضرت شیخ الہند بوجہ علالت اس اجلاس میں شرکت نہ کر سکے۔ ان کا خطبہ صدارت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے اجلاس میں پڑھ کر سنایا۔ خیال رہے کہ اس زمانہ میں تحریک خلافت شباب پر تھی۔ مقامات مقدسہ پر کسی ایک یا دوسری یوروپین طاقت یا ان کے کٹھ پتلی ٹولہ کا قبضہ تھا۔ ہندوستان میں ترک موالات (عدم تعاون) کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ یہ مسئلہ بھی چھڑا ہوا تھا کہ آیا ہمیں اپنے ہندو بھائیوں سے اس معاملہ میں تعاون کرنا چاہیے اس سیاسی

پس منظر کو ذہن میں رکھا جائے تو حضرت شیخ الہندؒ کے خطبہ صدارت کے یہ اقتباسات خوب سمجھ میں آسکتے ہیں۔

محترم حاضرین!

"آج جس اجلاس میں آپ تشریف فرما ہیں اور طویل وعریض سفر برداشت کر کے شریک ہو رہے ہیں، یہ وہ مقدس اجتماع ہے جس کا سنگ بنیاد بحکم "وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ" اور "اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ" اور "تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰی" رکھا گیا ہے۔ یعنی حق تعالیٰ جلّ شانہٗ نے اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کو بھی حکم فرمایا کہ اپنے اصحاب کرام سے مشورہ فرمایا کریں اور پھر مسلمان کی شان بھی یہی بیان فرمائی کہ وہ اپنے امور کا آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کرتے ہیں جن سے صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں کے تمام کام بالخصوص ایسے کام جن کا مسلمانوں کی جماعت سے تعلق ہے آپس کے مشورہ سے ہونے چاہئیں۔ یہ حکم تو ایسے جلسوں اور اجتماعوں کے جواز کی بنیاد ڈالتا ہے جو بغرض مشورہ منعقد کئے جائیں۔ اور ارشاد "تناجوا بالبرّ والتقویٰ" ان اجتماعوں کی نوعیت کو مقید کرتا ہے۔ یعنی مجلس مشاورت کا نیکی اور خوف خدا پر مبنی ہونا لازم ہے۔ پس تمام ایسے جلسے جن کا مقصد دین مقدس کی حمایت وحفاظت ہو اور جن میں نیکی اور بھلائی کے طریقوں پر غور کیا جائے اور جن میں خدائے قدوس کا خوف شامل حال رہے منعقد کرنا۔ ان میں شریک ہونا حکم خداوندی کی تعمیل اور سنت نبویہ کی اقتدا ہے۔"

٭ ٭ ٭

"چونکہ دور حاضر میں دشمنان اسلام نے مقامات مقدسہ کو غصب کر کے، اقتدار خلافت کو پامال کر کے مسلمانوں کے واجب الاحترام۔ جان و مال سے زیادہ عزیز مذہب کی توہین کی۔ اور ان کے دینی بھائیوں کی جان و مال عزت و آبرو کو برباد کیا۔ اس لئے تمام روئے زمین کے مسلمانوں پر فرض ہو گیا ہے کہ وہ اپنے دینی بھائیوں کی نصرت و اعانت اور

اپنے پاک مقدس مذہب کی حفاظت اور اعدائے اسلام کی مدافعت کے لئے کھڑے ہو جائیں۔

جمعیتہ علمأ ہند کے سامنے جہاں اور مذہبی و علمی فرائض ہیں وہاں اس وقت یہ فریضہ بھی اس کے پیش نظر ہے۔ بلکہ تمام دیگر فرائض سے مقدم اور اہم ہے۔

٭ ٭ ٭

"رہا یہ سوال کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بیرون ہند کے مسلمانوں کے ساتھ ایسا کون سا تعلق ہے جس کی وجہ سے ان پر سات سمندر پار رہنے والوں کی جانی و مالی امداد فرض ہو جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے اپنے پیرووں اور کلمہ گویوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ اتحاد و اخوت قائم کیا ہے۔ جو تمام قومی مصنوعی اتحادات سے بالاتر ہے۔ اس میں قومیت، لباس اور رنگت کا امتیاز نہیں۔ صرف خدائے واحد پر ایمان لانا ایک مغربی شخص کو اقصلئے مشرق میں رہنے والا کا بھائی بنا دیتا ہے۔ اور ان بُعد المشرقین کے رہنے والوں کے درمیان وہ تمام تعلقات قائم ہو جاتے ہیں جو ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے ساتھ حاصل ہو جاتے ہیں۔ حضرت حق جلّ شانہٗ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (قرآن مجید) یعنی تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں۔

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ان حقّا علی المُؤمِنِینَ ان یتوجّع بعضُہم لِبعض کما یَألم الجسدُ لِلرّاس" ——— کنزالعمال

یعنی مسلمانوں پر لازم ہے کہ ایک دوسرے کے لئے ایسے دردمند ہوں۔ جیسے سر کے درد میں باقی اعضائے بدن دکھ پاتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

المؤمنون کرَجُلٍ واحِدٍ ان اشتکی عینُہ اشتکیٰ کلُّہ وان

اشتکیٰ راسہ اشتکیٰ کلّہ (رواہ مسلم)

اس طرح ایک مسلمان کے درد اور دکھ سے تمام مسلمانوں کو درد اور تکلیف پہنچنا ضروری ہے۔ خدا تعالیٰ کے پاک فرمان اور رسول مقبول صلعم کے مقدّس ارشاد سے صاف ثابت ہو گیا کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے درد سے اس قدر صدمہ ہونا چاہیئے جس قدر ایک عضو کی تکلیف سے دوسرے اعضا کو تکلیف ہوتی ہے۔

یہ ہیں خدائے برتر اور اس کے پاک رسول کے صریح فرمان اور یہ ہیں مقدس مذہب اسلام کے جلیل القدر احکام جن کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان اپنے سمندر پار کے مذہبی بھائیوں کی امداد و اعانت کو اپنا مذہبی پاک فریضہ سمجھتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اگر ہم نے اس دردناک مصیبت میں ان کی بات نہ پوچھی۔ کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے رہے اور ان کو دشمنوں کا تختۂ مشق بن جانے کے لئے چھوڑ دیا اور ان کی امداد و اعانت میں امکانی کوشش نہ کی تو قیامت کے دن خدائے جلیل و جبار کے قہر سے چھٹکارا مشکل ہے۔"

٭ ٭ ٭

"یہاں پر طبعاً یہ سوال پیدا ہو گا کہ وہ کون سے واقعات ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو اس قدر بے چین اور مضطرب کر دیا ہے اور کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے بیرون ہند کے رہنے والے بھائیوں سے ہمدردی اور ان کی اعانت فرض ہو گئی ہے اس کا جواب دینے اور سننے کے لئے پتھر کا دل فولاد کا کلیجہ درکار ہے۔

"معزز ناظرین! دنیائے اسلام میں گذشتہ چند صدیوں سے سلطان ٹرکی کی واحد سلطنت اسلامی شوکت کی ضامن تھی اور حرمین محترمین (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ) بیت المقدس عراق وغیرہ کے تمام اماکن مقدسہ و مقامات محترمہ کی حفاظت کی کفیل تھی جمہور اہل اسلام کے اتفاق سے سلطان ٹرکی خلیفۃ المسلمین مانے جاتے تھے۔ اور خلافت

کے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتے تھے۔ ان کا عروج و ترقی اور ان کی سلطنت کی وسعت جابر و غاصب مسیحی سلطنتوں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ اور وہ ہمیشہ اسی فکر میں لگی رہتی تھیں کہ خلیفۃ المسلمین کا اقتدار گھٹایا جائے اور مستقر خلافت پر قبضہ کر لیا جائے۔

"یہاں تک کہ یہ جنگ عظیم (جنگ عظیم ۱۹۱۴ء) چھڑ گئی۔ جس کا واحد سبب طمع ملک گیری تھا۔ کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ ٹرکی کو بھی شریک جنگ ہونا پڑا۔ اور شریک بھی اس فریق (جرمنی) میں جو برطانیہ سے برسر پیکار تھا۔ اس وقت تمام عالم کے مسلمان جس مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ اور بالخصوص برطانوی حکومت میں رہنے والے مسلمانوں کو جو مشکلات پیش آئیں۔ اس کو خدائے علیم و حکیم ہی بہتر جانتا ہے۔ برطانوی مدبرین نے اپنی مسلمان رعایا کی تسلی کے لئے وقتاً فوقتاً چند اعلان شائع کئے۔ جن میں مسلمانوں کو اطمینان دلایا کہ ان کے مقامات مقدسہ پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔ اور مستقر خلافت پر کوئی معاندانہ قبضہ نہ کیا جائے گا۔ اگرچہ مسلمانوں کا اس وعدے پر یقین کر کے مطمئن ہو جانا سخت غلطی تھی۔ جس کا تلخ ترین مزہ آج ان کے روحانی ذائقہ کو تلخ بنا رہا ہے۔ لیکن واقعہ یوں ہوا کہ مسلمان اس وعدے پر مطمئن ہو گئے اور سلطنت برطانیہ کی جانی و مالی امداد کر کے شاندار فتح حاصل ہونے کے باعث بنے۔"

برطانیہ نے جیسے ہی ہوا کا رخ اپنے موافق دیکھا۔ فوراً عیاری کے داؤ چلنے لگے اور تمام دنیا کی مہذب قوموں کی آنکھوں میں خاک ڈال کر تمام وعدے نسیاً منسیاً (فراموش) کر کے مقامات مقدسہ پر قبضہ کر لیا۔ مستقر خلافت یعنی قسطنطنیہ کو فوجی قبضہ میں دبوچ لیا۔ سمرنا پر یونانیوں کو قبضہ دلا دیا۔ عرب کو ترغیب اور لالچ دے کر خلیفۃ المسلمین سے باغی بنا دیا۔ ترکی فوجوں سے ہتھیار رکھوا لئے اور اس غریب کو زمانہ التوائے جنگ میں بے دست و پا کر کے نہایت

ذلت آمیز شرائط صلح پر دستخط کرنے پر مجبور کیا۔ شرائط صلح میں خاص طور پر اقتدار خلافت کو زائل کرنے والی شرطیں لگائی گئیں۔ اور تمام دیگر طاقتوں کی مسلمان رعایا کا خلیفۃ المسلمین سے ذہنی سرپرستی کا تعلق منقطع کر دیا۔ ولی عہد ٹرکی کو حراست میں کر لیا اور اس قسم کے ہزاروں غیر منصفانہ سلوک کئے گئے۔

"ان لڑائیوں میں شام، عراق، سمرنا (ٹرکی) کے مسلمانوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ گئے۔ لاکھوں مسلمان قتل کئے گئے۔ لاکھوں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوئے۔ ہزاروں کلمہ گو خانہ ویران ہو کر وطن سے بھاگ نکلے۔ اور آج غیر ملکوں میں سڑکوں اور میدانوں پر بے یار و مددگار پڑے ہیں۔ سینکڑوں کے بدن کپڑا اور جان بچانے کے لئے قوت لایموت بھی میسر نہیں۔ سمرنا میں ہزاروں بے گناہ قتل کر دیئے گئے۔ عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ یہ ہیں وہ روح فرسا اور جانسوز واقعات جنھوں نے تمام عالم کے مسلمانوں کو بے چین کر دیا ہے۔ اور جس کے دل میں ذرا سا ایمان بھی باقی ہے۔ وہ سیماب دار بیقرار ہے۔ اور اپنا شرعی، اخلاقی اور قانونی فرض سمجھتا ہے کہ اپنے مظلوم بھائیوں کی نصرت و اعانت کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور جس طرح ممکن ہو اپنے بھائیوں کو دشمن کے نرغہ سے نکالے اور ان کے پنجۂ ظلم سے نجات دلائے۔ اخوت ایمانی کی ایک عالمگیر لہر اٹھی۔ اور طرفۃ العین میں مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک دوڑ گئی۔ سوئے ہوؤں کو بیدار کر دیا۔ بیداروں کو اٹھا کر کھڑا اور کھڑے ہوؤں کو بے محابا دوڑایا۔ حجرہ نشیں زاہد، کتاب کے کیڑے طالب علم، مدرسوں میں درس دینے والے برق تقریر عالم دکانوں پر بیٹھنے والے تاجر اسباب ڈھونے والے مزدور سب ایک صف میں آکر کھڑے ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ دُول یوروپ (یوروپی ممالک) بالخصوص برطانیہ کی ظالمانہ اور غاصبانہ پالیسی دیکھ کر ۳۱ کروڑ برادران وطن بھی ان کے ساتھ ہمدردی کے لئے تیار ہو گئے۔"

برادران وطن! تمہاری اس مصیبت میں جس قدر بھی تمہارے ساتھ ہمدردی کی ہے۔ اور کر رہے ہیں۔ وہ ان کی اخلاقی مروت اور انسانی شرافت کی دلیل ہے۔ اسلام نے احسان کا بدلہ احسان قرار دیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ احسان اس کا نام ہے کہ آپ اپنی چیز کسی کو دیدیں۔ کسی دوسرے کی چیز اٹھا کر دینے کو احسان نہیں کہتے۔ اس لئے آپ برادران وطن کے احسان کے بدلہ میں وہی کام کر سکتے ہیں۔ جو اخلاقی اور شریفانہ طور پر اپنے اختیارات سے کر سکتے ہوں۔ مذہبی احکام خدا کی امانت ہیں۔ ان پر تمہارا اختیار نہیں ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ حدود مذہب کے اندر رہ کر تم احسان کے بدلہ میں احسان کرو اور دونوں قومیں (فرقے) مل کر ایک ایسے زبردست دشمن کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ جو تمہارے مذہب تمہاری آزادی کو پامال کر رہا ہے۔

جماعت علما جو حقیقتاً مسلمانوں کے مذہبی قائد ہیں۔ ان کا فرض ہے اس وقت موقعہ کی نزاکت اور اہمیت کو نظر انداز نہ کریں۔ آپس کے نزاع اور اختلاف میں پڑ کر اصل مقصود کو خراب نہ کریں۔ ورنہ مسلمانوں کی خرابی اور بربادی کی تمام تر ذمہ داری انھیں پر عائد ہوگی۔ علمی تدقیقات (تحقیقات) کے لئے آپ کے واسطے بہت سے میدان کھلے ہیں۔ عبادت و ریاضت کے لئے بہت سی راہیں آپ کو بلا شرکت غیرے حاصل ہیں۔ مگر جو کام کہ جبل اُحد اور میدان بدر میں ہوا وہ مسجد نبوی جیسی مقدس جگہ کے مناسب نہ تھا۔ آج احتجاج اور مطالبہ حقوق کے میدان صرف مظاہروں کے پلیٹ فارم ہیں۔ خلوتیں اور تنہائی کی راتیں اس کے لئے کافی نہیں۔ اگر موجودہ زمانہ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت اعدار کے لئے جائز ہو سکتا ہے۔ (باوجودیکہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں) تو مظاہروں، قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں بھی شامل نہ ہوگا۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے لئے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز

نہیں یہی چیز ہتھیار ہیں"

٭ ٭ ٭

جمعیتہ علماء ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ دلی کی سیاسی اہمیت یہ ہے کہ اس میں علماء کے پلیٹ فارم سے حکومت برطانیہ سے ہر طرح کے تعلقات توڑنے یعنی عدم تعاون کی تحریک کی مکمل حمایت کی گئی۔ چنانچہ اجلاس کی تجویز نمبر ۲ میں کہا گیا ہے۔

"جمعیتہ علماء ہند کا یہ اجلاس کامل غور کے بعد مذہبی احکام کے مطابق اعلان کرتا ہے کہ موجودہ حالت میں گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ ترک موالات۔ اور نصرت کے تمام تعلقات اور معاملات رکھنے حرام ہیں جس کے تحت حسب ذیل امور بھی واجب العمل ہیں"

۱۔ خطابات اور اعزازی عہدے چھوڑ دینا۔
۲۔ کونسلوں کی ممبری سے علیحدگی اور امیدواروں کے لئے رائے نہ دینا۔
۳۔ دشمنان دین کو تجارتی نفع نہ پہنچانا
۴۔ کالجوں، اسکولوں میں سرکاری امداد قبول نہ کرنا۔
۵۔ دشمنان دین کی فوج میں ملازمت نہ کرنا اور کسی قسم کی فوجی امداد نہ پہنچانا
۶۔ عدالتوں میں مقدمات نہ لے جانا اور وکیلوں کے لئے ان مقدمات کی پیروی نہ کرنا۔

اسی اجلاس میں یہ تجویز بھی منظور کی گئی۔

"جمعیتہ علماء ہند کا یہ اجلاس اپنے ملکی بھائیوں کی خلافت کے مسئلہ میں شرکت عمل کو بنظر امتنان و تشکر دیکھتا ہے اور مسلمانوں سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنے ہم وطن بھائیوں سے حدود شرعیہ کے اندر رہ کر اور زیادہ خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کی

کوشش جاری رکھیں گے۔"

جمعیتہ علما کے اس اجلاس میں ایک اور اہم تجویز قومی درس گاہوں کے طرز عمل کے متعلق منظور کی گئی۔ یہ تجویز ایک طرح کا فتویٰ ہے جو آگے چل کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا سبب بنی۔ تجویز کا مضمون یہ ہے۔

"جمعیتہ علماء ہند کا یہ اجلاس نہایت افسوس اور درد کے ساتھ بعض علماء زمانہ کے اس طرز عمل سے مخالفت اور بریّت کا اظہار کرتا ہے۔ جنھوں نے ترک موالات جیسے صریح اور واضح حکم شرعی کے وجوب اور نفاذ سے انکار کیا ہے۔ یا اس بارے میں شکوک وشبہات عارض (پیش) کئے ہیں نیز اعلان کرتا ہے کہ علما ہندان کے فعل کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اور عام مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ ان افراد کے قول و فعل کو عام علما کا حکم تصور نہ کریں۔"

حضرت شیخ الہندؒ کی اختتامی تقریر: ۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء کو اختتامی اجلاس میں بھی صدر حضرت شیخ الہندؒ کی تقریر پڑھ کر سنائی گئی۔ ذیل کے اقتباس سے اس تقریر کی روح کا اندازہ ہوگا۔

"ہم سب کو مل کر متوکلاً علی اللہ (خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے) ان طے شدہ تجاویز پر عمل کرنا اور کرانا چاہئے۔ جن سے ہمارے ایمان، ہمارے کعبہ، ہماری خلافت، ہماری عزت وآبرو، ہمارے مقامات مقدسہ اور ہمارے وطنی وقومی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ اگر اس وقت بھی ہم نے غفلت اور تن آسانی اختیار کی تو شاید عافیت حاصل کرنے کا یہ آخری موقعہ ہوگا جس کو جان بوجھ کر ہم اپنے ہاتھ سے کھو دیں گے جو صراط مستقیم آپ نے معلوم کرلیا ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں اس پر سیدھے چلے جائیں اور یمین وشمال (دائیں بائیں) کی جانب مطلق التفات نہ کیجئے۔

جو لوگ اس وقت آپ سے علیحدہ ہیں ان کو بھی حکمت اور موعظہ حسنہ سے اپنی

جماعت کے اندر جذب کیجئے۔ اور اگر اس میں مجادلہ (بحث) کی نوبت آئے تو وہ "بِالّتی ھی احسن" (خوش اسلوبی کے ساتھ) ہونا چاہئے ———— کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کی ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم ہنود کو کسی نہ کسی طریقہ سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنایا ہے اور اس میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اجتماع کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کرکے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمائد و رہنماؤں نے کی ہے اور کر رہے ہیں۔ اس کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حال اگر اس کے خلاف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو آئندہ ہمیشہ کے لئے ناممکن بنادے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لئے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست کر سکے گی"۔

اس اجلاس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ علماء نے شرعی اعتبار سے ترک موالات (عدم تعاون) کے وجوب کا فتویٰ دیا۔ جمعیۃ علما کے اجلاس دوم منعقدہ دلی (۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء) کی مذکورہ تجاویز کو فتوے کی شکل دیدی گئی اس میں انگریزی حکومت سے تعاون کو حرام قرار دیا گیا۔ اس اجلاس میں سرکردہ علماء کے علاوہ بنگال، سندھ اور صوبہ سرحد کے تقریباً ۵۰۰ علما شریک ہوئے تھے۔ فتوے پر ۴۷۴ علمانے دستخط کئے فتوے میں کہا گیا تھا کہ انگریزی حکومت

سے تعاون، ان کی ملازمت کرنا، ملازم کرانا، فوج میں بھرتی ہونا بھرتی کرانا سب حرام ہے۔ ۱۰ جولائی سنہ ۱۹۲۱ء جمعیۃ علمار ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں اور دسری طرف خلافت کانفرنس میں اس فتوے کی توثیق کی گئی۔ فتوے کی وسیع پیمانہ پر اشاعت کی گئی تھی۔ ۸ راگست سنہ ۱۹۲۱ء کو برطانوی حکومت نے فتویٰ ضبط کر لیا۔ ستمبر سنہ ۱۹۲۱ء میں اس فتوے کی تائید و حمایت کرنے والے جمعیۃ علمار ہند کے رہنماؤں اور دیگر زعمار کو ملک کے مختلف مقامات سے گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ سزا پانے والوں میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا نثار احمد، پیر غلام مجدد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو شامل ہیں۔ ان حضرات کو دو دو برس قید بامشقت کی سزا دی گئی، سیشن جج نے اپنے فیصلہ میں لکھا تھا:

"ملزمان کے مذہب و جذبات و عقائد کو بالکل نظرانداز کر دیا جائے — یہ اندرون ہند اسلام نوازی ہے۔ ان تمام کارروائیوں سے یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ دراصل موجودہ انقلاب اور بے چینی کا اصلی باعث نام نہاد علمار کی سازشی جماعت جمعیۃ علمار ہند ہے جو خفیہ سازشیں نہیں، عظیم الشان جلسے طلب کر کے بڑے بڑے پنڈالوں میں کھلم کھلا سازش کرتی ہے۔"

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام، ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں اس لحاظ سے ایک موثر شمار ہوگا کہ پہلی بار تعلیمی نظام کو اس ملک کی ضروریات اور قومی امنگوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے اس ملک میں نیا نصابِ تعلیم رائج کرتے ہوئے تعلیم کے لئے یہ بنیاد قرار دی تھی۔

"ہمیں تعلیم کے ذریعہ ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہیئے جو جسمانی لحاظ سے تو ہندوستانی ہو لیکن اس کا دل و دماغ ہمارے طرز پر سوچتا ہو۔" نئے نظام تعلیم میں جہاں یہ خوبی تھی کہ اس کے ذریعہ جدید علوم و فنون سکھائے جاتے تھے وہاں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اس میں ایک خاص حد تک ذہنی غلامی ساتھ آتی تھی۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں میں دو تعلیمی نظام ابھرے۔ ۱۸۶۶ء میں دیوبند میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کا مقصد ایک طرف اسلامیات کی اشاعت اور مسلمانوں میں دین کا تحفظ کرنا تھا تو دوسری طرف غیر ملکی آقاؤں کے لئے ایک "مزاحمتی تحریک" کو بھی باقی رکھنا تھا۔ ادھر سرسید نے مسلمانوں کی پست حالی اور درماندگی کو دور کرنے کا نسخہ یہ تجویز کیا کہ ۱۸۵۷ء میں علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او کالج کی بنیاد رکھی وہ اس معاملہ میں مخلص تھے۔ اس تعلیم کا مقصد نئے نظامِ حکومت کے تحت زندگی کی دوڑ میں حصّہ لینا تھا۔ لیکن حکمرانوں یعنی انگریزوں نے اس نظامِ تعلیم کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔

۱۹۲۰ء میں کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں نان کوآپریشن (عدم تعاون) کا ریزولیوشن منظور ہوا اس میں سرکاری ملازمتوں، عدالتوں اور محکموں کے بائیکاٹ کی اپیل کی گئی تھی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عدم تعاون کا مسئلہ پیش آیا تو کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ لیکن کچھ اس کے حق میں تھے۔ مہاتما گاندھی نے درمیانی راہ نکالی۔ چنانچہ حکیم محمد اجمل خاں، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، معظم علی، ظہور احمد، شوکت علی، محمد اسماعیل خاں اور حاجی موسیٰ خاں کے دستخطوں سے ایک مشترکہ مراسلہ مسلم یونیورسٹی کے ذمہ داروں کے نام بھیجا گیا جس میں ان سے عدم تعاون کی اپیل کی گئی تھی جسے نامنظور کر دیا گیا تھا کورٹ کے اجلاس میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مسٹر عبدالمجید خواجہ اور تصدق احمد خاں شروانی نے پھر ایک بار ممبران کو عدم تعاون کی دعوت دی۔ اس کا الٹا اثر ہوا اور ممبران نے ان حضرات کے خلاف عدم اعتماد کا ریزولیوشن پاس کر دیا۔ اس پر ان قومی رہنماؤں نے طلبا سے اپیل کی کہ وہ یونیورسٹی چھوڑ دیں پانچ سو سے زائد طلبا نے اس دعوت پر لبیک کہا۔ اب رہنماؤں کے سامنے یہ سوال آیا کہ ان کے لئے کوئی اور قومی یونیورسٹی قائم کی جائے یا انھیں تحریکِ عدم تعاون کے پرچار کے لئے ملک مختلف علاقوں میں بھیجا جائے۔ حکیم صاحب، ڈاکٹر انصاری، عبدالمجید خواجہ، تصدق احمد خاں شروانی وغیرہ کی رائے تھی ایک قومی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ چنانچہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ کا قیام علی گڑھ کے چند مکانات میں عمل میں آیا۔ اسی تاریخ کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے درسگاہ کا افتتاح کیا اس زمانہ میں آپ بیمار تھے خدام نے آپ کو سفر سے منع کیا۔ لیکن حضرت شیخ کا جواب یہ تھا کہ اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو میں جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا۔ چنانچہ آپ علی گڑھ پہونچے۔ آپ کا خطبہ صدارت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھ کر سنایا۔

حضرت شیخ الہند کے خطبہ صدارت کے اہم اقتباسات ذیل میں دیئے جاتے ہیں

"اس قدر گذارش کرتا ہوں کہ تا وقتیکہ متکلم اور مخاطب کے دل میں سعی جمیل کا جذبہ اس کے اخلاق میں شجاعانہ استقامت و ایثار، اس کے جوارح (اعضا) میں قوت عمل اور اس کے ارادوں میں پختگی اور چستی نہ ہو۔ محض گرمجوش تقریریں کسی ایسے کٹھن اور بلند پایہ مقصد میں آپ کو کامیاب نہیں کرسکتیں"

کیف الوصول الی سعاد و دونہا
قُلل الجبال و دونہن حتوف

ترجمہ: سُعاد تک کیسے پہونچوں؟ میرے اور اسکے درمیان پہاڑ کی چوٹیاں اور انکے نیچے گھاٹیاں ہیں

یقین رکھیئے کہ جس صحرائے پُرخار میں آپ گامزن ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں اس کے راستہ سے جنت کا دروازہ بہت ہی قریب ہے۔ کامیابی کا آفتاب ہمیشہ مصائب و آلام کی گھٹاؤں کو پھاڑ کر نکلا ہے۔ اور اعلیٰ تمناؤں کا چہرہ سخت سے سخت صعوبتوں کے جھرمٹ میں سے دکھائی دیتا ہے .....

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یعلم اللہ الذین جاھدو منکم ویعلم الصابرین ؁

ترجمہ: کیا تم نے خیال کیا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے بدون اس کے کہ اللہ جانچ کرے تم میں سے مجاہدین اور صابرین کی۔

ایک اور موقعہ پر ارشاد فرماتے ہیں۔

الٓمٓ۔ احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون ؁ ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکذبین ؁

ترجمہ: کیا لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ محض اتنا کہنے پر وہ چھوڑ دیئے جائیں گے۔ حالانکہ

ہم نے ان سے پہلے لوگوں کی آزمائش کی ہے۔ تو ضروری ہے کہ اللہ پرکھے گا سچے اور جھوٹے لوگوں کو۔

✣ ✣ ✣

"یہ حق تعالیٰ شانہ کی سنت مستمرہ ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی و تغیر کی راہ نہیں کوئی قوم اللہ جل شانہ کی محبت اور اس کے راستہ پر چلنے کی مدعی نہیں ہوئی۔ جس کو امتحان و آزمائش کی کسوٹی پر نہ کسا گیا۔ خدا کے برگزیدہ اور اولو العزم پیغمبر جن سے زیادہ خدا کا پیار کسی پر نہیں ہو سکتا۔ بے شک ان کو مظفر و منصور کیا گیا۔ مگر کب! سخت ابتلاء اور زلزال شدید (سخت جھٹکوں) کے بعد۔ پس اے فرزندان توحید! میں جانتا ہوں کہ آپ انبیاء مرسلین اور ان کے وارثوں کے راستہ پر چلیں اور جو لڑائی اس وقت شیطان کی ذرّیت (اولاد) اور خدائے قدوس کے لشکروں میں ہو رہی ہے۔ اس میں ہمت نہ ہاریں۔ اور یاد رکھیں کہ شیطان کے مضبوط سے مضبوط آہنی قلعے خداوند قدیر کی امداد کے سامنے تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔"

✣ ✣ ✣

"میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت (کمزوری) کی حالت میں جس کو آپ خود مشاہدہ فرما رہے ہیں۔ آپ کی دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں۔ جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے۔ لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغہ سے بچاؤ۔ ان کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب و ضرب کا۔ حالانکہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہیئے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قاہری

انتقام ہے۔ اور دنیا کی متاع قلیل خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی"!

٭ ٭ ٭

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار۔ جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں و کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا۔ اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔ کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک سیرت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں۔ اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں۔ لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔ آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں۔ وہ بھی جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بے شک کہا گیا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے۔ جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں۔ یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں۔ یا حکومت وقتیہ کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا ہی اچھا ہے۔ اب از راہ نوازش آپ ہی انصاف کیجئے کہ یہ تعلیم سے روکنا تھا یا اس کے اثر بد سے۔ اور کیا یہ وہی بات نہیں، جس کو آج مسٹر گاندھی اس طرح ادا کر رہے ہیں۔" ان کالجوں کی اعلیٰ تعلیم بہت اچھے اوصاف اور شفاف دودھ کی طرح ہے۔ جس میں تھوڑا سا زہر ملا دیا گیا ہے"! ہاں ضرورت اس کی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو۔ اور اغیار کے

اثر سے کلیتہً آزاد ہو۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات کے اور کیا باعتبار اوضاع و اطوار کے۔ ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔ ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالجوں کا نمونہ ہونے چاہئیں ہند اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یوروپ کو اپنا شاگرد بنایا۔"

"ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درس گاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول و فروع سے بے خبر ہوں اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں۔ اور ان میں اپنی ملّت اور اپنے ہم قوموں کی قیمت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جاتے تو یوں سمجھو کہ وہ درس گاہ مسلمانوں کی موت کی صنعت بنانے کا آلہ ہے اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گو سلطنت کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ اور جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔"

"مجھے لیڈروں سے زیادہ ان نونہالان وطن کی ہمت بلند پر آفریں اور شاباش کہنا چاہئے جنھوں نے اس نیک مقصد کی انجام دہی کے لئے اپنی ہزاروں امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اور باوجود ہر قسم کے طمع و خوف کے وہ موالات نصاریٰ کے ترک پر نہایت مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قائم رہے۔ اور اپنی عزیز زندگیوں کو ملت اور قوم کے نام پر وقف کر دیا۔"

❊ ❊ ❊

خطبہ صدارت میں ترک موالات کا ذکر ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں یہ تحریک شباب پر تھی۔ ترک موالات کے جواز کو قرآنی آیات سے ثابت کیا گیا ہے۔ اس طویل عبارت کا صرف آخری حصہ دیا جاتا ہے۔

"میری غرض یہ ہے کہ آپ ترک موالات پر نہایت دیانتداری سے عمل کریں۔ اور خالص خدا پر نظر رکھیں۔ اور جن طلبا سے حقوق واجبہ فوت نہ ہوتے ہوں۔ وہ اس تحریک کی تبلیغ میں حصہ لیں۔ بقدر ضرورت تعلیم دینی اور ضروریات زندگی حاصل کرنے کے بعد آج کل یہ مشغلہ نہایت سودمند ہے ـــــ بالکل آخر میں مجھے یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ تحریک ترک موالات کا موجودہ حالات میں کامیاب بنانا صرف اس پر منحصر ہے کہ کوئی حرکت ہماری طرف سے ایسی نہ ہونی چاہیئے۔ جو نقض امن یا سفک دمار (خوں ریزی) کی موجب ہو۔ اور یہی نصیحت اس ملک کے تمام سربرآوردہ دانشمندوں کو ہے۔ اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لیا جائے۔ ورنہ فائدہ کی جگہ نقصان کا اندیشہ ہے۔"

:.

جامعہ ملیہ۔ تعلیم کے قومی نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کا آغاز تھا۔ جوں جوں یہ ادارہ فروغ پاتا گیا اس کے مقاصد ابھر کر سامنے آتے گئے۔ جن میں حضرت شیخ الہندؒ کے نظریات کی یہ روح کارفرما رہی۔ چنانچہ دوسرے برس دسمبر ۱۹۲۱ء میں جب جامعہ کا پہلا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا تو مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا۔

"میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ہم نے اصولی حیثیت سے تعلیم کو صحیح شاہراہ پر ضرور ڈال دیا ہے۔ اور جہاں ہم نے سچے مسلمان پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کیں۔ وہاں اس بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے کہ تعلیم و تربیت میں ماحول کا ایک

بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ اور اسلامیت کے ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا بھی ہمارے پیش نظر تھا۔ چنانچہ اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کہ جہاں ہندو طلبا کے لئے بہت سے اسلامی معاملات پر معلومات حاصل کرنا ضروری ہے۔ وہاں مسلمان طلبا بھی اہم ہندو رسوم اور ہندو تہذیب و تمدن سے ناآشنا نہ رہیں گے ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کی اساس محکم اسی باہمی افہام و تفہیم پر منحصر ہے"

جامعہ ملیّہ اسلامیہ کا قیام ملک کی تعلیمی تاریخ میں ایک نیا تجربہ تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء تک اس دور کے تعلیمی نظاموں سے ہٹ کر سوچنا بھی غلط سمجھا جاتا تھا۔ یہ بات سمجھانی بہت مشکل تھی کہ ہندوستانی سرکاری اعانت و امداد سے بے نیاز ہو کر خود بھی کوئی تعلیمی نظام قائم کر سکتے ہیں۔ جس میں ان کے عقائد، اور ثقافتی روایات و کردار کی ضمانت ہو۔ ہمارے قومی رہنماؤں نے جن میں حضرت شیخ الہندؒ، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری شامل ہیں، اس تجربہ کو کامیاب کر دکھایا۔

مولانا محمود حسنؒ کا علمی مقام

مولانا محمود حسنؒ جن اساتذہ کے شاگرد تھے وہ اپنے دور کی علمی دنیا کے آفتاب درخشاں تھے۔ مولانا محمود حسنؒ نے ان سے کسب فیض کیا اور جملہ اسلامی علوم وفنون میں قابل رشک حد تک کمال حاصل کیا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، اور تصوف، غرض کہ اسلامیات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں آپ کو عبور حاصل نہ ہو۔ آپ نے مجموعی طور پر ایک درجن سے زائد تالیفات، شرحیں اور تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ آپ کے علمی مرتبہ کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حرمین شریفین میں درس حدیث دینے کا شرف آپ کو حاصل ہوا۔ ستمبر ۱۹۱۵ء میں جب آپ حج پر تشریف لے گئے۔ اس وقت سے لے کر دسمبر ۱۹۱۶ء میں گرفتاری تک درس حدیث آپ کے خاص دینی مشاغل کا ایک حصہ تھا مولانا سید اصغر حسینؒ نے مکہ معظمہ میں قیام کے زمانہ کے متعلق لکھا ہے۔

دن کو حضرت اپنے مکان اقامت میں بخاری شریف کا درس دیتے تھے یہاں بعض لوگ ہندی تھے۔ اور اکثر حاضرین اردو سمجھنے والے تھے اس لئے اردو میں تقریر فرماتے تھے۔ (حیات شیخ الہندؒ)

مدینہ منورہ میں بھی حضرت کے درس حدیث کی دور دور شہرت ہوگئی۔

مولانا اصغر حسینؒ لکھتے ہیں۔

"مولانا حسین احمدؒ اور ان کے شاگردوں کے اصرار سے حضرت نے

بخاری شریف کا درس دینا قبول فرمایا اور مولانا موصوف کے مکان ہی پر بعد نماز ظہر تا عصر حلقہ درس قرار پایا۔ مولانا حسین احمد کے فیض یافتہ لوگوں کے سوا مدینہ منورہ کے معزز و معتبر شائقینِ علوم برغبت و شوق شریک ہو کر خوشہ چینی کرنے لگے ــــ بلند آواز سے عربی میں تقریر کرتے اور ایسے اعلیٰ مضامین بیان فرماتے جو دید تھے نہ شنید ــــ تقریباً پانچ ماہ تک ایک عجیب پر لطف علمی مجمع قائم رہا۔ معلوم ہوتا ہے حق تعالیٰ نے محض تکمیل درجات کے لئے حضرت کو یہاں پہونچایا تھا۔ اس لئے زیادہ عرصہ تک یہ روحانی فیض کی مجلس برقرار نہ رہ سکی۔ (حیات شیخ الہند)

شیخ الہندؒ جب اپنے استاذ محترم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور دوسرے اکابر کے ہمراہ ۱۲۹۴ھ میں حج کے لئے تشریف لے گئے تھے تو اس وقت خود حضرت نانوتویؒ کے استاذ حدیث مولانا شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنیؒ اور آپ کے مرشد حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ بقید حیات تھے حضرت نانوتویؒ اپنے شاگرد مولانا محمود حسنؒ کو بھی ان کی خدمت میں ساتھ لے جایا کرتے تھے حضرت شاہ عبدالغنی مجددی ان کے ساتھ لطف و عنایت سے پیش آتے۔ واپسی کے قریب حضرت نانوتویؒ نے تحریک فرمائی تو حضرت شاہ صاحبؒ نے شیخ الہند کو سند حدیث کی اجازت عنایت فرمائی۔ حضرت شیخ الہندؒ کی تصنیفی و علمی خدمات کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

ترجمہ قرآن:۔ قرآن کریم کا ترجمہ بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت سب سے مشکل کام ہے۔ بلکہ تفسیر قدرے آسان ہے۔ ترجمہ قرآن کے لئے مختلف علوم میں مہارت تامہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ مثلاً لغت دانی اور صرف و نحو میں کمال ضروری ہے۔ لفظ کے معنی، صفت، مبتدا اور خبر کو سمجھنے

میں ذرا سی لغزش ہوتی اور ترجمہ پایۂ اعتبار سے گرا۔ قرآن کریم کے لفظی ترجمہ پر اس لئے بھی زور دیا جاتا ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے۔ اس میں متکلم (خداوند تعالیٰ) کے منشاء و مقصد کو جوں کا توں سمجھا جائے ـــــ اس کے بعد مرادی ترجمہ ہے جو نسبتاً آسان کام ہے۔ تفسیر کا باب بڑا وسیع ہے۔ ایک بحرِ ذخّار ہے۔ کسی خاص آیت کی مفسرین نے کیا تشریح کی ہے اور مفسر مختلف اقوال میں سے کس قول کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ خود مفسر کے علم اور کمال کا امتحان ہوتا ہے۔

شیخ الہندؒ کے ترجمہ سے پہلے کئی قرآنی تراجم موجود تھے۔ مثلاً حضرت شاہ عبدالقادرؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ، اور مولانا اشرف علی تھانویؒ (تفسیر بیان القرآن) کے تراجم۔ لیکن شیخ الہندؒ نے حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کو اپنے ترجمہ کی بنیاد بنایا۔ حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ ہر لحاظ سے مکمل ہے لیکن زبان میں تبدیلی کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اس لئے امتدادِ زمانہ سے اس ترجمہ کے بعض کلمات و محاورات متروک ہو گئے۔ شاہ صاحب کے ترجمہ میں اختصارِ عبارت کچھ زیادہ ہے جو اہلِ علم اور مشقت پسند ذہنوں کے لئے بالکل ٹھیک ہے لیکن عام لوگوں کے لئے ان کا مفہوم سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔ حضرت شیخ الہند نے اسی ترجمہ کو بنیاد بنا کر آسان، سلیس اور عام فہم زبان میں ترجمہ کیا۔ سفرِ حجاز سے پہلے دس پاروں کا ترجمہ کر چکے تھے۔ سفرِ حجاز، گرفتاری اور بعد ازاں مالٹا میں نظر بندی کے واقعات پیش آئے۔ جیل میں آپ نے ایک برس کی معمولی مدت میں ۲۰ پاروں کا ترجمہ مکمل کر لیا اس کے بعد آپ نے حواشی اور فوائد لکھنے شروع کئے۔ سورۂ نساء تک حواشی لکھ پاتے تھے کہ اس دوران میں رہائی عمل میں آگئی۔ رہائی کے بعد وفات تک تقریباً چھ ماہ کی مدت میں گوناگوں مشاغل اور بیماری نے کسی کی بھی علمی کام کا موقعہ نہ دیا۔ حواشی اور

فوائد کے نام سے باقی ۲۶ پاروں کی تفسیر شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانی نے مکمل کی۔ ذیل میں 'آیتہ الکرسی' کا ترجمہ نمونہ کے طور پر درج کیا جاتا ہے۔ جس سے اندازہ ہو جائے گا۔

"اللہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے سب کا تھامنے والا۔ نہیں پکڑ سکتی اس کو اونگھ اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ایسا کون ہے جو سفارش کرے اس کے پاس مگر اجازت سے۔ جانتا ہے جو کچھ خلقت کے روبرو ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ وہ سب احاطہ نہیں کر سکتے اس کی معلومات میں سے مگر جتنا کہ وہ چاہے۔ گنجائش ہے اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین کو۔ اور گراں نہیں اس کو تھامنا ان کا۔ اور وہی ہے سب سے برتر عظمت والا۔"

ادلہ کاملہ:۔ ایک اہل حدیث عالم مولانا محمد حسین بٹالوی نے احناف کے کئی مسائل پر اعتراض کیا تھا۔ حضرت شیخ الہند نے اس کا مدلل اور تفصیلی جواب دیا۔ بلکہ اہل حدیث کے کچھ مسائل پر ٹھوس اعتراضات کئے۔

ایضاح الادلہ:۔ مولانا محمد حسین بٹالوی نے تو ادلہ کاملہ کا کوئی جواب نہیں دیا ہاں ایک اور اہل حدیث عالم مولانا محمد احسن صاحب سے "مصباح الادلہ" کے نام سے کتاب لکھوائی۔ اس میں ادلہ کاملہ کا جواب دینے کی کوشش کی گئی حضرت شیخ الہند نے اس کا بھی جواب ایضاح الادلہ کے نام سے لکھا۔

احسن القریٰ:۔ دلی کے کسی اہل حدیث عالم نے گاؤں میں جمعہ پڑھنے کو جائز قرار دیتے ہوئے فتویٰ صادر کیا تھا کہ جمعہ کے لئے شہر یا گاؤں کی کوئی قید نہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس فتوے کے جواب میں 'اوثق العریٰ' کے نام سے حنفیہ مسلک ثابت کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ حیات

میں دیہات میں جمعہ کا کوئی وجود نہ تھا۔ اہل حدیث نے اس کی تردید لکھی اور حنفی مسلک پر شدید نکتہ چینی کی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نے احسن القریٰ کے نام سے اسکا جواب لکھا ہے۔

الجہد المقل:۔ مولانا احمد حسن پنجابی نے مسئلہ امکان کذب کے رد میں ایک مبسوط رسالہ لکھا اور اس میں مولانا محمد اسماعیل شہید اور ان کے ہم عقیدہ لوگوں کو گمراہ فرقہ قرار دیا۔ شیخ الہندؒ نے "الجہد المقل فی تنزیہ المعز والمذل" کے نام سے اس رسالہ کے الزامات کو رد کیا۔

الابواب والتراجم:۔ حضرت امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں ایک خاص ترتیب سے ابواب باندھے ہیں۔ ہر باب کے تحت متعلقہ احادیث لاتے ہیں۔ باب الاحادیث کی مناسبت سمجھنا ضروری ہے۔ عام طور پر اساتذہ دورہ میں تقریر کے ذریعہ اسے سمجھاتے ہیں۔ شیخ الہند نے مالٹا میں زمانہ قید میں یہ رسالہ لکھا۔ علم حدیث میں آپ کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ اسی سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حاشیہ مختصر المعانی:۔ عربی میں بلاغت کی مشہور کتاب مختصر المعانی ہے آپ نے اس کا حاشیہ لکھا۔ یہ حاشیہ آپ کے اعلیٰ علمی ذوق کا مظہر ہے۔

افادات محمود:۔ یہ کتاب آپ کے دو اہم اور قیمتی مضامین کا مجموعہ ہے وحی اور اس کی عظمت پر اور "لا ایمان لمن لا امانۃ لہٗ (حدیث: جس میں امانت نہیں۔ ایمان نہیں) کے عنوان پر رسالہ القاسم میں آپ کے دو مضمون شائع ہوئے تھے۔ ان کو کتاب کی شکل دیدی گئی۔

تصحیح ابی داؤد:۔ ابوداؤد شریف کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے آپ نے کئی برس تک ابوداؤد شریف کا درس دیا۔ اس کے مختلف نسخوں کی کتابت

اور اختلاف عبارت نگاہ میں تھی۔ آپ نے مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک صحیح ترین نسخہ کی تدوین کی۔

تقریر بخاری و تقریر ترمذی :۔ حضرت شیخ الہندؒ نے سالہا سال شیخ الحدیث کی حیثیت سے بخاری شریف و ترمذی شریف کا درس دیا۔ ان کو تحریر میں لانے کا موقع کم ہی ملا۔ بخاری شریف اور ترمذی شریف کی یہ دو تقریریں شاگردوں کی اکٹھی کی ہوئی ہیں، اور الگ الگ شائع کی گئیں۔

کلیات شیخ الہند :۔ اس میں آپ کا کل منظوم کلام ہے۔ مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ نے تمام منظوم کلام کو یکجا کر کے کلیات شیخ الہند کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں ایک طرف مختلف اکابر کی وفات پر کہے گئے مرثیے موجود ہیں۔ تو دوسری طرف ترکوں کی جنگ اور اسی طرح کے موضوعات پر اشعار موجود ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ ایک طرف فقہ، حدیث اور تفسیر میں ایک خاص درجہ رکھتے تھے دوسری طرف شاعری کا زائد وصف بھی رکھتے تھے۔
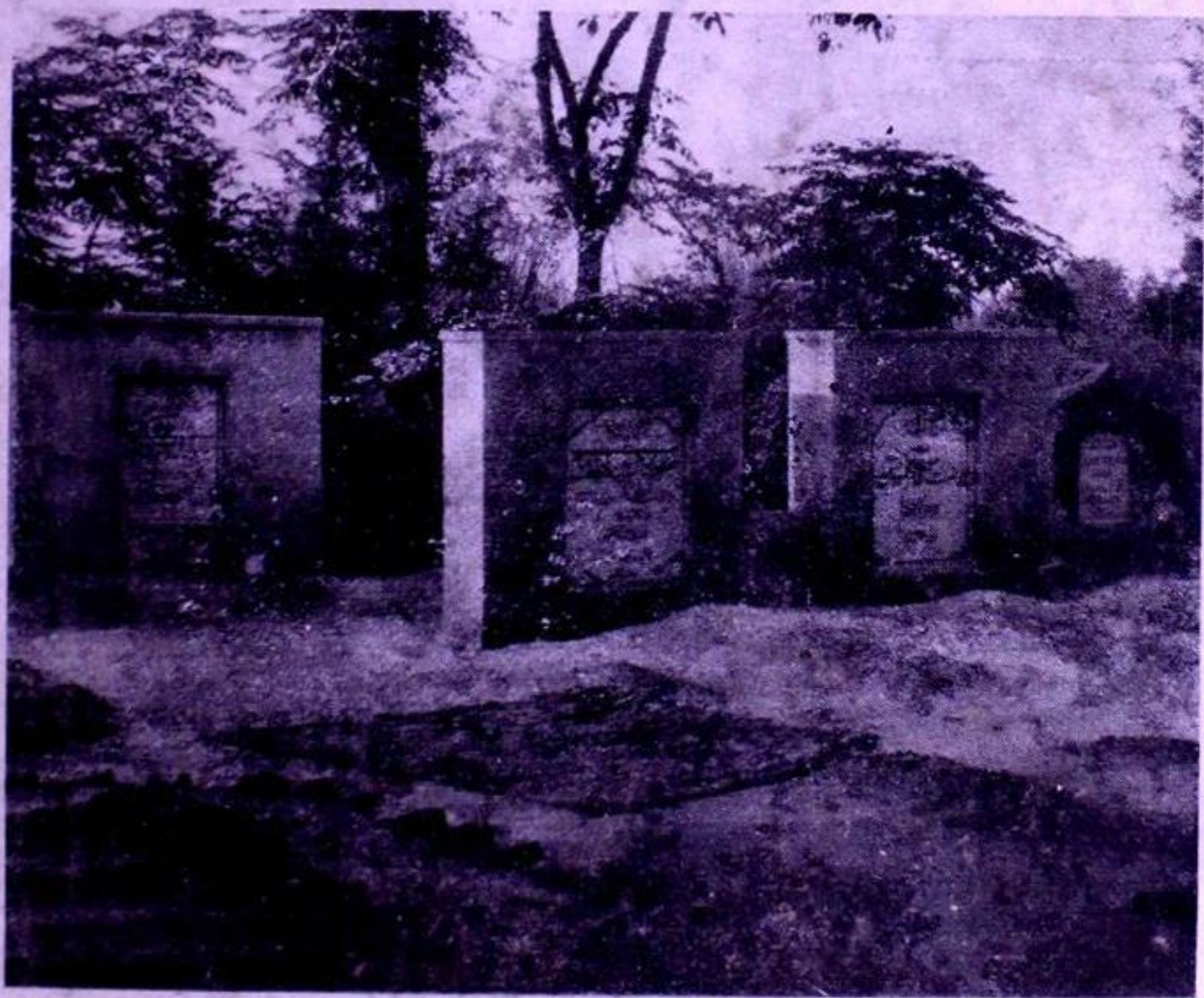
دیوبند کے قبرستان میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ
شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن ؒ، اور شیخ الاسلام حضرت
مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ کی آخری آرامگاہ۔